188389

OUP—398—29-4-72—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 9 ٩٢٢٥٩١٨٣١ Accession No. ٢٤٥٠٩

Author ٣٠٩ ، محمد عبد الشبور

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

لکھنؤ کے بے مثل سخنورِ اردو کے لاثانی زبان آور

میر انیس اعلی اللہ مقامہ کا تذکرہ موسوم بہ

حیاتِ انیس

تالیف

مولانا سید امجد علی صاحب اشہری

مطبع آگرہ اخبار آگرہ میں خواجہ صدیق حسین منیجر

کے اہتمام سے چھپا

۹۲۸ ۵۹
ح

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

فردوسیٔ اُردو میر انیس اعلے اللہ مقامہٗ کا تذکرہ موسوم بہ



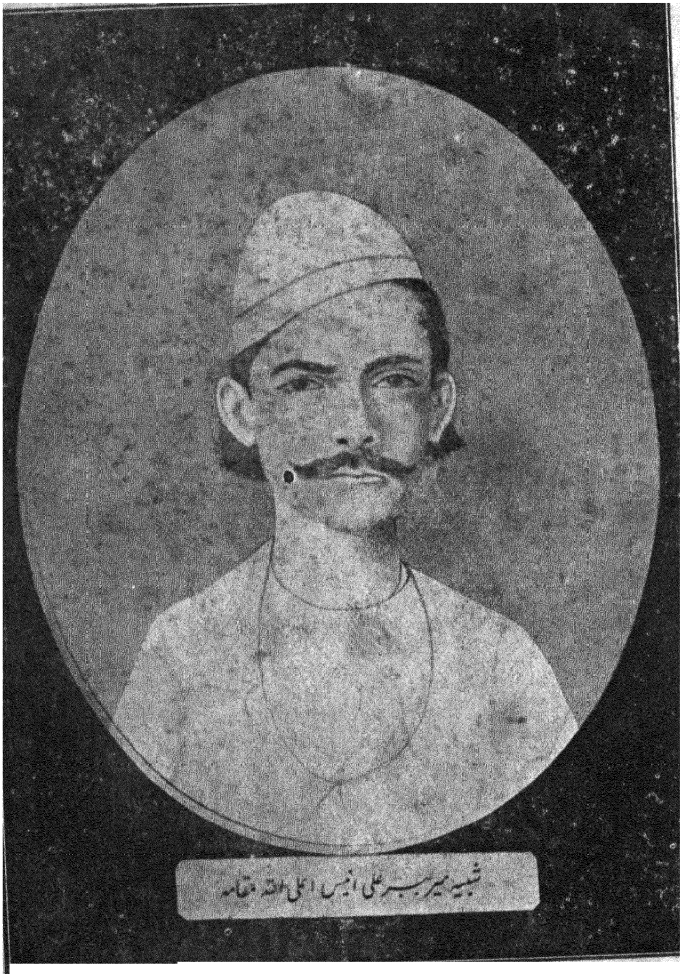
حیاتِ انیس

اردو کی جان ہے فصاحت کی کان ہے ہر بند انتخاب ہے
ہر شعر لاجواب ہے
نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

تالیف مولانا سید امجد علی صاحب اشہری

مطبع آگرہ اخبار میں چھاپا گیا

جملہ حقوق بذریعہ رجسٹری محفوظ ہیں



شبیہ میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ

فہرست مضامین

حیات انیس

مطالب	صفحہ	مطالب	صفحہ
حمد و نعت	۱	میر انیس کی تعلیم	۱۹ - ۲۰
بنیاد خیال	۱ سے ۳	میر انیس کی تربیت	۲۰-۲۱
کلام منظوم بیاد میر انیس مرحوم مع	۲ سے ۶	میر انیس اور فنون سپہگری	۲۲-۲۳
مطالب دیباچہ		میر انیس اور ورزش	۲۳
سب سے پہلے مرثیہ کہا گیا	۷	میر انیس کی خلوت	۲۳-۲۴
میر انیس کا شجرہ	۸	میر انیس کا دربار	۲۴
میر غلام حسین ضاحک	۹	میر انیس کی حسن پرستی	۲۵
میر حسن	۱۰-۱۵	میر انیس کی شکل و صورت	۲۵-۲۶
میر خلیق	۱۵-۱۸	میر انیس کی وضع	۲۶
میر انیس کی پیدائش	۱۸ - ۱۹	میر انیس کی پہلی مجلس	۲۷-۲۹

مطلب	صفحہ
شاہی مجلس	۲۹-۳۱
مجلس عظیم آباد	۳۱-۳۳
مجلس حیدر آباد	۳۳-۳۴
الہ آباد کی مجلس	۳۴ ۳۵
شیش محل لکھنؤ میں میر انیس کی آخری مجلس	۳۵
میر انیس کی تصنیف کی مقدار	۳۶ ۳۷
میر امشاہدہ اور واقفیت	۳۷ ۳۸
میر انیس کا مزار	۳۹
شمس العلماء مولانا آزاد کی رائے و تحقیق	۴۰ ۴۵
میر انیس کے حریف مقابل میر زادبیر	۴۵ ۴۷
شمس العلما مولانا حالی کی رائے	۴۷ ۴۹
جناب شمس العلماء مولانا امداد امام صاحب اثر عظیم آباد کی رائے	۴۹ ۵۰
شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی رائے کا اقتباس از کتاب موازنہ انیس و دبیر	۵۰ ۶۲
میر انیس پر اجمالی نظر	۶۲ ۶۶
انگریزی شاعری کے مقابلہ میں	۶۷ ۹۲

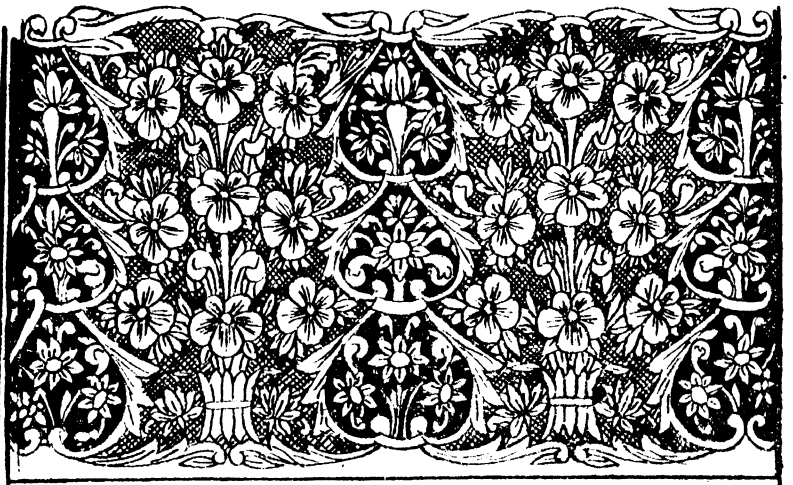
مطلب	صفحہ
اردو شاعری اور انگریزی شاعروں کے مقابلہ میں میر انیس اور اردو شاعر۔	
عربی زبان میں مرثیہ کس شان سے کہا گیا۔	۹۳ ۹۴
مرثیہ عربی تصنیف مفتی میر عباس صاحب شوستری مرحوم	۹۵ ۱۰۶
کلام فارسی	۱۰۶ ۱۱۳
جنگ دارا و سکندر از نظامی	
نمونہ کلام فردوسی از شاہنامہ	
ترکی سے اردو کا مقابلہ	۱۱۳ ۱۱۸
ارباب سنت والجماعت پر مرثیہ کا اثر	۱۱۹ ۱۲۱
ہندوؤں پر مرثیہ کا اثر	۱۲۱ ۱۲۷
رباعی۔ میر انیس کی اکثر رباعیاں جو شاعری اور اخلاق و نصائح سے متعلق ہیں۔	۱۲۷ ۱۳۸
غزل گوئی۔ میر انیس کے سلاموں سے غزلیں بنا کر دکھائی گئی ہیں۔	۱۳۸ ۱۴۴

مطلب	صفحہ
قصیدہ۔ میر صاحب کے مراثی میں قصیدہ کے تمام اوصاف موجود ہیں۔	۱۴۴ ۱۴۵
مثنوی۔ میر انیس کے مرثیے مثنوی بنا کر دکھائی ہے۔	۱۴۵ ۱۵۰
رجز۔ عربی کے مقابل میں میر انیس کی رجز گوئی کے چند نمونے پیش کئے گئے ہیں۔	۱۵۱ ۱۶۰
مناجات۔ میر انیس کا جداگانہ طرز۔	۱۶۰ ۱۶۲
میر انیس کی سیف زبانی اس کے تحت میں طرح طرح سے شمشیر زبان کے جوہر دکھائے گئے ہیں جس کی نظیر کسی زبان میں نظر نہیں آتی مع اسلحہ دیگر۔	۱۶۲ ۱۹۰
میر انیس کے رشحات قلم کی جولانیاں اس کے تحت میں گھوڑوں کی تعریف اور میدان جنگ میں اُن کی حالتوں کے لاثانی فوٹو کھینچے گئے ہیں۔	۱۹۰ ۲۰۸

مطلب	صفحہ
میر انیس کی معجز بیانیوں کے مختلف نمونے۔ اس میں میدان جنگ کی چوٹوں۔ بہادروں کے طریقہ جنگ اور میدانِ کارزار کے مختلف واقعات پیش کئے گئے ہیں۔	۲۰۹ ۲۲۳
اشعار بتعریف سراپا۔ اس میں شاعری کا رنگ دکھایا گیا ہے۔	۲۲۴ ۲۳۲
نعت سرور کائناتؐ	۲۳۲ ۲۳۳
گرمی کا سفر۔ مسافرت کا عالم۔	۲۳۳ ۲۵۰
صبح کی سینہ زیاں	۲۳۹
خوفناک جنگل۔ اندھیری رات	۲۴۱
جاسوس کا خبر دینا۔ امام علیہ السلام کا خیمہ۔ امام حسینؑ کی نماز جماعت وغیرہ وغیرہ مناسب خیال لکھکر چند چند بند لکھے گئے ہیں	
بے نقطہ بند	۲۵۰
اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد کا میرزا اوج اور میر رشید کی	۲۵۱ ۲۵۲

مطلب	صفحہ
مرثیہ خوانی کو سماعت فرمانا۔	
نقلیات - میرانیس کے متعلق	۲۵۳ ۲۵۹
میرانیس اور سرقہ۔ نعوذ باللہ	۲۶۱
میرانیس کی زبان پر چڑھے ہوئے	۲۶۱ ۲۶۵
الفاظ اور فصیحانہ بندش۔	

مطلب	صفحہ
میرزا دبیر کا رنگ	۲۶۵ ۲۶۶
پرانی ترکیبیں اور پرانے الفاظ	۲۶۶ ۲۶۸
عربی لفظوں کی تنغیص اور فارسی	۲۶۸
لفظوں کی ترکیب	۲۶۹
لکھنؤ میں میرانیس کا یادگار	۲۷۰



بسم اللہ الرحمن الرحیم

رباعی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگ جاں سے ہے اُس پر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

زلافِ حمد و نعت او لے است بر خاک ادب خفتن
سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

اللھم صل علی محمدؐ و آل محمدؐ۔

بنیادِ خیال

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے مشہور بانی سرسید احمد خان بہادر کا انتقال ہوا راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ جو سرسید کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی کے عالی شان

کمرے میں سرسید کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب نعمانی کے سپرد تھا۔ میں اکثر جی بہلانے کو وہاں جا بیٹھتا۔ ایک روز علامہ شبلی نے مجھ سے کہا کہ اردو میں میر انیس کا درجہ ایسا ہے جیسے فارسی میں فردوسی کا درجہ۔ تمام ملک میں اُن کے کلام کی داد دی جاتی ہے۔ ہندو مسلمان اُن کے ادائے کلام کے شیفتہ اور سنی و شیعہ اُن کے طرز بیان کے فریفتہ ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ اُن کے حالات زندگی پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگر تم سے ہو سکے تو یہ کام کرنے کا ہے۔ میں بھی کچھ مدد دوں گا۔ میں یہ خیال اپنے ساتھ لیتا گیا اور لکھنؤ۔ لاہور۔ عظیم آباد۔ الہ آباد۔ میں بعض اصحاب کو خط لکھے تاکہ جو حالات اُنہیں معلوم ہیں وہ مجھے معلوم ہوں اور میں اُنہیں قلمبند کر کے وقف عام کر دوں۔ لیکن کہیں سے حسب دلخواہ جواب نہ ملا۔ کسی صاحب نے میر صاحب کی مشہور رباعیاں نقل کر کے بھیجدیں۔ کسی صاحب نے ان مرثیوں کے چند بند لکھ کر عنایت کئے جو چھپ چکے ہیں۔ اس وقت میں نے ایک نظم لکھی جو ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

کلام منظوم بیاد میر انیس مرحوم

بتاؤں آپ کو کیا تھے انیس خوش گفتار	زباں سے اُن کی برستے تھے گوہر شہوار
کلام اُن جواب کلام فردوسی	بیان اُن کا بیان کلیم خوش گفتار
براق بن کے نکلتا انیس کا گھوڑا	جواب صاعقہ دیکھی انیس کی تلوار
لکھی جو صبح تو کاغذ پہ روشنی پھیلی	لکھی جو شام تو گیسوئے حور تھے اشعار
کیا جو صورت وادی کربلا کو رقم	تو اسکے سامنے تھے گرد گلشن و گلزار
دکھائی باغ کے نشو و نما کی گر حالت	تو چلنے لگ گئی صحن چمن میں باد بہار

تمام طرز بیاں سہل ممتنع اُن کا
جو تھا انیس کو آساں وہ غیر کو دشوار

زبان کوثر و تسنیم سے دھلی اُن کی
دہان معدن گوہر بیان لولو بار

انیس شاہِ اودھ کے سلام کو نہ گئے
کھلا تھا اُنکے لئے اہلبیت کا دربار

طبیعت اُن کی روانی میں ابرِ نیساں تھی
برستے اُس سے ہمیشہ تھے گوہر شہوار

خدا گواہ کبھی یہ فصاحتیں نہ سُنیں
برب کعبہ نہ ایسا فصیح خوش گفتار

بلاغتوں کے لگے ڈھیر ہر طرف اُن کی
فصاحتوں کے لگے اُنکے سامنے انبار

انیس اُن کا تخلص میر علی تھا نام
نہ لکھنؤ کے شرف بلکہ تھے وہ فخر دیار

میں اُن کی کثرت تصنیف کو بتاؤں کیا
سُنا عزیزوں سے اُنکے ہے ڈھائی لاکھ شعار

کیا انیس نے احسان زبانِ اُردو پر
انیس وادیٔ اُردو کو کر گئے گلزار

رباعیوں میں بھری ہیں بلاغتیں کیا کیا
مسدسوں میں نظر آئے مثنوی کی بہار

جو نکتہ چیں ہیں سلاموں سے چھانٹ سکتے ہیں
غزل کے رنگ قصیدے کی طرز کے اشعار

ہر ایک صنف سخن پر انیس قادر تھے
وہ ایک رنگ میں دکھلا گئے چمن کی بہار

حسین ابن علی کو ملا ہے وہ حساں
کہ جس سے بلبلِ سدرہ کی بند ہو منقار

وہ دیکھو تھوڑے سے لشکر کی آمد آمد کو
وہ دیکھو آتا ہے کس شان سے علم بردار

وہ گھوڑے ٹاپوں سے کس طرح روندتے ہیں زمیں
وہ دیکھو چلتی ہے کس کس بناؤ سے تلوار

وہ باندھتے ہیں کمر کس شکوہ سے غازی
وہ کیسی ہلتی ہے شیروں کی ڈونگنے سے کچھار

ہیں شاہنامہ میں صدہا لڑائیاں لیکن
کیا انیس نے اک جنگ مختصر کو ہزار

ہزار طرح سے لکھا ہے اس لڑائی کو
ہزار طرح سے کھینچی انیس نے تلوار

ہزار طرح سے باندھا ہے ایک مضمون کو
ہزار طرح سے دوڑائے تو سن و رہوار

وہ چھک پڑے ہیں کہیں گر سبو و ساغر پر
تو پھر ہے سرد ظہوری کی گرمی بازار

وہ فن مرثیہ گوئی کو علم کر کے گئے
ہیں اس پہ حجت قاطع انیس کے اشعار

ملے وہ مبدءِ فیاض سے انہیں مضموں
جو اہلبیت کے ہیں خاص لایق دربار

دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا
بڑے شکوہ سے دکھلائی ہیئتِ گفتار

مگر انیس کو فردوسی سخن پایا
دبیر مثل نظامی ہوئے مرصع نگار

انیس مہر سپہرِ کمالِ فن سخن
دبیر ماہ کمالِ سپہرِ عز و وقار

شعاعِ مہر کلامِ نفیس[۵۱] سے پیدا
کلامِ اوج[۵۲] شب مہ کی طرح پُر انوار

بڑے بڑے علما اُن کے حاملِ معنی
بڑے بڑے ادبا اُن کے ناقلِ گفتار

بڑے بڑے فصحا انکے قایلِ بندش
بڑے بڑے بلغا اُنکے واصفِ اشعار

کہا یہ مجھ سے مکرر جناب شبلی نے
کہ میں انیس کی لائف لکھوں برسمِ کبار

مگر ہے اسکے لئے علم شے ضرور مجھے
ہر ایک طرح کے حالات ہیں مجھے درکار

جو آپ مجھ کو مدد دیں تو ہوں میں لکھ سکتا
وگرنہ آپ کو جو سہل ہے مجھے دشوار

یہ نظم رسالہ مخزن لاہور میں طبع ہوکر اخباروں میں نقل ہوئی۔ اور اس خیال کی تائید اور نظم کی تعریف میں کئی خط آئے۔ زاں بعد میرے لڑکے "سید منظر علی جعفری" نے کئی اخباروں میں اس مقصد سے اشتہار دئے کہ جن صاحبوں کو جناب غفران مآب کے حالات معلوم ہوں وہ لکھ بھیجیں لیکن اس پر بھی بجز وعدہ فرصت کسی صاحب نے کچھ نہ لکھا۔ ایک صاحب یہی لکھتے رہے کہ اب ماہ مبارک رمضان ہے اس میں فرصت کہاں۔ اب محرم آگیا فرصت معلوم۔ اب چہلم آیا۔ اب نوروز کا زمانہ ہے اس لئے معذور ہوں۔ آیندہ فرصت ملی تو لکھونگا۔ یہانتک کہ میں نے لاچار ہوکر خط لکھنا چھوڑ دیا۔

مولانا شبلی صاحب نے کچھ مدد دینے کا وعدہ فرمایا تھا وہ خود "موازنہ انیس و دبیر"

---

۵۱ میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم خلف میر انیس اعلی اللہ مقامہ۔

۵۲ میرزا اوج سلمہ اللہ تعالی خلف میرزا دبیر نور اللہ مرقدہ۔

لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ ادھر میں نے میر انیس کے متعلق حالات جمع کرنے کا لگا دیا تھا اور اُن کے اقتباس کلام کو متفرق اوراق پر لکھتا رہا جس سے کچھ مواد جمع ہو گیا۔ اس کا ذکر مولانا شبلی صاحب سیکرٹری صیغۂ ترقی اُردو نے اپنی رپورٹ میں کر دیا۔ پھر اُن کے بعد جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب سیکرٹری صیغہ ترقی اُردو رئیس بھیکن پور (علی گڑھ) نے بکرات و مرات اس کام کے پورا کر دینے کو لکھا اور آخر میں تحریر فرمایا کہ جو کچھ جمع ہو گیا ہے وہ شائع کر دیا جائے اور جو آیندہ معلوم ہو وہ دوسرے ایڈیشن کے لئے رکھا جائے۔ مجھے یہ خیال ایک حد تک مناسب معلوم ہوا لیکن باطنی جذبات نے ایک آخری کوشش کو اس سے زیادہ مناسب جانا۔ اور میں اپنی ذات سے لکھنؤ آیا تاکہ میر انیس مرحوم کے ارباب خاندان و معتقدین سے کچھ سرمایہ حاصل کر سکوں یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ میر انیس مرحوم کے رشتہ داروں میں سے ایک صاحب میر انیس کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں جو دوسرے کو نہیں مل سکتے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہ ہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

سوائے اس کے باقیات الصالحات میں جو موجود ہیں وہ میر صاحب کے حالات زندگی پر ایک ایسا پردہ پڑا رہنا پسند فرماتے ہیں جو عام آنکھیں میر صاحب کو نہ دیکھ سکیں جب تک کہ وہ بطور حاجب کے اُس پردہ کو نہ اٹھائیں۔ یہاں تک کہ میر انیس کے جو مرثئے منشی نولکشور صاحب آنجہانی مالک مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے پانچ جلدوں میں چھپوا دیئے اُن کے سوائے دوسرے مرثئے اور سلام و رباعیاں بھی اُس پردہ میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی نئی نئی صورتیں بدلنے کا موقع باقی رہے یا یہ کہ اُس کی عام شہرت سامعین کے دلوں سے اس کے رنگ جدت کو پھیکا نہ

کر دے۔ اور الحق اُن کے لئے یہ خیال مفید اور ضروری ہے۔ اب رہے معتقدین اُن کی یہ کیفیت ہے کہ اُن کو میر صاحب کی تشریف آوری یا میر صاحب کی مجالس میں اپنی نمود و نمایش کا فخر ہر طرح کے صرف و اظہار ارادات کا موقع دیتا تھا جو میر صاحب کے بعد صرف برائے نام باقی رہ گیا ہے۔ وہ میر انیس کے نام سے اپنی شہرت کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ اُن کو اپنی طرف سے میر انیس کی شہرت مقصود نہیں اس لئے مجکو یہاں آنے پر بھی بہت کم حالات دریافت ہوئے۔ تاہم اس مجموعہ میں جو کچھ لکھا گیا وہ اور جگہ نہ ملے گا۔ اسی طرح اقتباس کلام میں زیادہ تر شاعری اور ادب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ خیالات مذہبی کو موضوع کلام نہیں بنایا گیا۔ تاکہ ہندو مسلمان۔ سنی شیعہ اور انگریزی تعلیم یافتہ جو اُردو کو اپنی زبان جانتے ہیں فصیح اُردو کے شایق ہیں اس سے عام دلچسپی حاصل کریں۔

ربیع الاول ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں یہ مجموعہ مرتب کیا گیا۔

راقم

سید امجد علی اشہری

سب سے پہلے مرثیہ کہا گیا

قسمت کیا ہر چیز کو قسام ازل نے	جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو یہ دانہ کو جلنا	غم ہم کو دیا سب میں جو مشکل نظر آیا

دنیا میں پہلے تاریکی پیدا ہوئی۔ پھر روشنی نے جلوہ دکھایا۔ مسلمانوں میں ہر سال کی تاریخ کا پہلا ورق غم سے شروع ہوتا ہے۔ اور آخر میں یہ بارہ ورق کا روزنامچہ خوشی (عید و بقر) کے صفحے پر جا کر تمام ہو جاتا ہے۔ محرم غم کی بدایت اور ذبیحہ خوشی کی نہایت کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی تاریخوں کے موافق دنیا کی پیدائش کا دیباچہ غم سے شروع ہوتا ہے حضرت آدم صفی اللہ کا جنت سے نکالا جانا بجائے خود افسانۂ غم اور پھر اُنکے ابتدائی آلام مرثیہ بیاں نوحہ ماتم نظر آتے ہیں۔ شاعری میں سب سے پہلا شعر مرثیہ میں کہا گیا۔ یعنی حضرت آدم کے بیٹے ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کو قتل کر ڈالا تو حضرت آدم روئے اور اپنے مقتول بیٹے کے صدمۂ فراق میں جو نوحہ کیا وہ موزوں شعر بن گیا۔ پس اقسام شعر میں مرثیہ کو تین طرح کی بزرگی حاصل ہے۔

(۱) اول یہ کہ شاعری میں سب سے پہلے مرثیہ کو موزونیت کا لباس مرحمت ہوا۔

(۲) دوسرے وہ تمام دنیا کے سب سے پہلے آدمی کی زبان سے نکلا۔

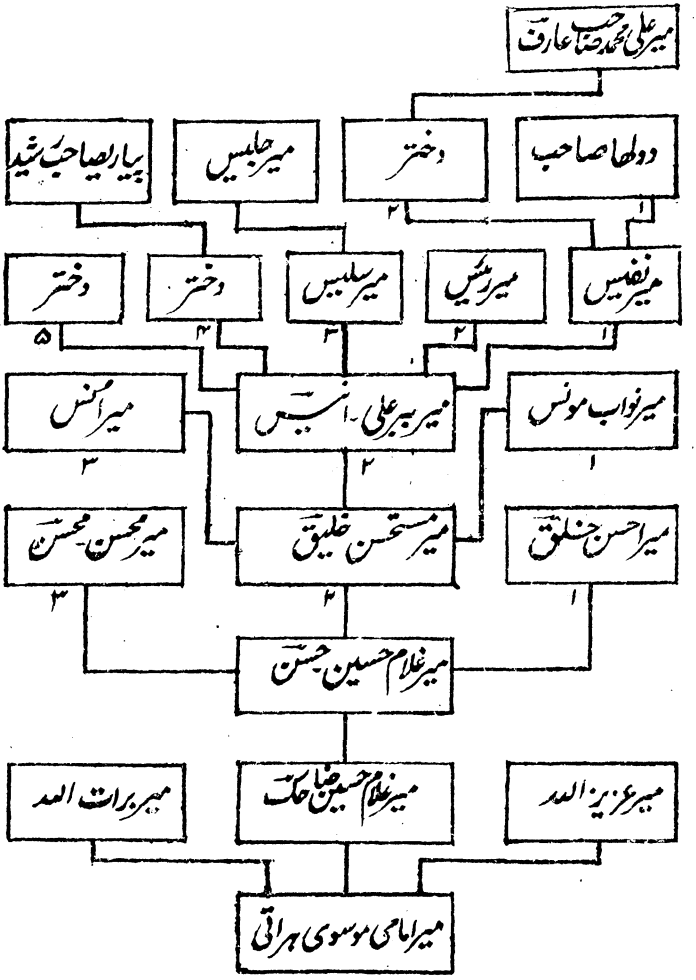
(۳) تیسرے اُس کو ایک پیغمبر کی زبان سے نکلنے کا فخر حاصل ہوا۔

جیسے ہی مہینوں میں محرم اول ہے	ہے مرثیہ اقسام ادب سے پہلے
دنیا میں جو نظم فن کی بنیاد پڑی	آدم نے کہا مرثیہ سب سے پہلے

لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

میر انیس کا شجرہ

یارب مرا نہالِ تمنا ھرا رہے
یہ نخلِ باغِ دہر میں پھولا پھلا رہے



میر غلام حسین ضاحک

میر ضاحک کا نام سید غلام حسین تھا۔ تذکرۂ آبجیات میں لکھا ہے کہ ان کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے۔ صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی لکھتے ہیں کہ دلی میں بھجل مسجد کے پاس رہتے تھے اور حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ میر مرحوم کی ولادت محلہ سید واڑہ میں ہوئی کہ پرانی دلی میں ایک محلہ تھا۔ خاندان سیادت انکا سندی تھا۔ امامی ہروی کی اولاد میں تھے اور شاعری بھی گھرانے میں میراث چلی آتی تھی۔ میر موصوف نہایت خوش مزاج خندہ جبیں ہنسنے ہنسانیوالے تھے۔ اسی واسطے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ عربی میں شرح لا تک اور فارسی میں استعداد تمام بہم پہنچائی تھی۔ وضع اور لباس قدمائے دہلی کا پورا نمونہ تھا سر سبز عمامہ عرب کی وضع کا۔ بڑے گھیر کا پاجامہ یا جبہ کہ وہ بھی اکثر سبز ہوتا تھا گلے میں خاک پاک کا کنٹھا۔ ہاتھ میں داہنی کلائی میں ایک چوڑی اُس پر کچھ دعائیں کندہ چھنگلی بلکہ اور انگلیوں میں بھی کئی کئی انگوٹھیاں۔ ڈاڑھی کو مہندی لگاتے تھے۔ ریش بچہ منڈاتے تھے کبھی کبھی ہاتھوں کو مہندی ملتے تھے۔ میانہ قد۔ رنگ گورا۔ دیوان ابتک نظر سے نہیں گزرا جس پر رائے ظاہر کی جائے۔ سلطنت کی تباہی نے ان سے بھی دلی چھڑوائی اور فیض آباد (اودھ) کو آباد کیا۔ ہر چند چاہا کہ اُنکے مجلسوں اور باہمی گفتگوؤں کے لطائف و ظرائف معلوم ہوں کچھ نہ ہوں تو چند غزلیں ہی مل جائیں۔ کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ تاریخ وفات بھی نہیں ملی صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی ۱۹۶ھ میں لکھتے ہیں کہ میر ضاحک فیض آباد میں ہیں اور وارستگی سے گزران کرتے ہیں۔ میر حسن مرحوم انکے صاحبزادے تھے جو دلی میں پیدا ہوئے اور دلی سے باپ کے ساتھ فیض آباد گئے۔ میر ضاحک کی ایک فارسی رباعی بطور تبرک نقل کی جاتی ہے۔

لہ میر حسن (میر ضاحک کے صاحبزادے) فرماتے ہیں "قبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالیٰ با اینہمہ قدرت علم چوں طبائع سامعان، رادر خور سخن بلند نیافتند بقدر حوصلۂ آنہا طرف ہزل تو سن قلم را ندند بحکم آنکہ مصرع ع

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

فریاد داں کہ نغمگساراں رفتند		سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند	
چوں بوے گل آمدند بر باد سوار		در خاک چو قطرہ اے باراں رفتند	

میر حسن

میر غلام حسن نام حسن تخلص تھا۔ پرانی دلی میں سید واڑہ ایک محلہ تھا وہاں پیدا ہوئے تھے۔ عالم شباب میں اپنے والد "میر ضاحک" کے ساتھ فیض آباد گئے اور نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی سرکار میں نوکر ہو گئے۔ پھر لکھنؤ گئے خندہ جبیں شگفتہ مزاج ظریف طبع تھے۔ میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ قوانین شرافت کے پابند۔ جب تک دلی میں رہے پہلے اپنے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے اودھ میں جاکر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے پھر مرزا رفیع السودا کو غزل دکھانے لگے۔ لکھنؤ میں آکر انکے کلام نے شہرت کا رنگ اڑایا۔ انکے اشعار غزل کے رنگ میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے مثنوی بدر منیر میں بےنظیر کا قصہ بےنظیر لکھا ہے۔ زمانہ نے اسکی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوا لیا اسکی صفائی بیان اور لطف محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا۔ اور ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں کے کلام میں اکثر الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں جو آج متروک و مکروہ سمجھی جاتی ہیں لیکن میر حسن کا کلام جیسا جب تھا ویسا اب ہے ہمارے ملک سخن میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنہوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک مثنوی سحر البیان دوسرے مثنوی گلزار نسیم۔ میر حسن کا دیوان اب نہیں ملتا حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ انواع سخن سے لبریز ہے صاحب گلزار ابراہیمی ۱۱۹۶ھ میں کہتے ہیں کہ میر حسن نے اپنا کلام مجھ کو بھیجا ہے اور جو خط لکھا ہے اس کی اصل عبارت یہ ہے

از سائر اقسام اشعار ابیات مدونہ من ہشتاد ہزار بیت است

تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ و اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام
مدتے است کہ از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ بانواب سالار
جنگ و خلف ایشاں ملقب بہ نوازش علیخاں
سرفراز جنگ بہادر سیگزرانم۔

میر حسن کے دو صاحبزادوں نے نام پایا۔ ایک میر خلیق۔ دوسرے میر ضاحک لیکن میر حسن کے بیٹوں کو زمانہ نے اتنی فرصت نہ دی جو وہ اپنے باکمال باپ کے اشعار کی تدوین کرتے اسلئے اس مجموعہ نے شہرت عام کا موقع نہ پایا۔ میر حسن نے ۱۲۰۱ھ ہجری آغاز محرم میں رحلت کی۔ مفتی گنج لکھنؤ میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے۔ کہتے ہیں پچاس برس سے زیادہ عمر میں انتقال کیا۔ شیخ مصحفی نے انتقال کی تاریخ لکھی۔

تاریخ

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں		روزاں گلزار رنگ و بو بتافت	
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی		شاعر شیریں زباں تاریخ یافت	

اب میں رسالہ اردوئے معلی علی گڑھ سے میر حسن کے مزید حالات کا اقتباس کرتا ہوں۔

میر حسن

از سنہ ۱۱۴۰ ہجری تا سنہ ۱۲۰۱ ہجری

نام و خاندان میر غلام حسن نام حسن تخلص خلف میر غلام حسین ضاحک، آبا و اجداد انکے ہرات کے رہنے والے تھے۔ امامی ہروی نے کہ میر حسن کے جد تھے انقلاب زمانہ کے ہاتھوں وطن اصلی کو چھوڑ کر پرانی دہلی میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ میر ضاحک دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور میر حسن کا ابتدائی زمانہ بھی وہیں بسر ہوا۔

وضع وعادت اس باب میں منشی کریم الدین نے ۱۸۴۸ء کی زبان میں گارسن دتسی کا قول اسطرح پر ترجمہ کیا ہے کہ میر حسن اپنے باپ کے خلاف اسباب میں تھا کہ ڈاڑھی اپنی بالکل صفاچٹ کرواتا اور پگڑی اگلے وقت کی لوگوں کی سی باندھتا اور پوشاک اپنے باپ کی سی[۵] پہنتا قد اچھا بڑا تھا رنگ بھورا۔ وہ ظریف اور خوش خلق آدمی تھا۔ مگر بیہودہ اور کلام معیوب زبان سے کبھی نہ نکالتا تھا۔ سوائے ازایں شیریں مزاج اور پسندیدہ تعلیم یافتہ تھا کسی نے اُسکو بُرا نہیں لکھا اور نہ کچھ الزام لگایا لیکن بعض کتابوں میں جو انکی تصویر دیکھنے میں آئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے سر پر بانکی ٹوپی۔ تن میں تنزیب کا انگرکھا پھنسی ہوئی آستینیں کمر سے دوپٹہ بندھا ہوتا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ دہلی میں انکا طرز لباس وہی ہوگا جو اُنکے والد کا تھا لیکن قیام لکھنؤ کے زمانہ میں اس میں بہت کچھ تبدیلی ہو کر آخر کار وہی وضع قرار پا گئی۔

سلسلہ شاعری میر حسن کو لڑکپن ہی سے شعر و شاعری کا بدرجہ کمال شوق تھا۔ چنانچہ بزمانہ نوعمری شاہجہان آباد میں میر درد سے غزل کی اصلاح لیتے تھے۔ پھر جب فیض آباد میں آباد ہوئے تو ضیاء الدین ضیا اصلاح دیتے تھے۔ کبھی کبھی میرزا رفیع السودا کو بھی غزل دکھا لیتے تھے لیکن درحقیقت میر حسن مستقل شاگرد ضیا کے ہیں جو میر تقی کے شاگرد تھے۔

علمی استعداد مولوی کریم الدین[۶] لکھتے ہیں کہ میر حسن عربی نہ جانتے تھے لیکن فارسی سے بخوبی آگاہ تھے۔ اور فارسی میں عمدہ شعر کہتے تھے۔

اولاد و شاگرد میر حسن نے باوجود کامل اُستاد ہونیکے کسی کو اپنا مستقل شاگرد بنانا پسند نہ کیا حتی کہ اپنے صاحبزادے میر حسن خلیق کو بھی خود اصلاح نہ دی بلکہ مصحفی کے سپرد کر دیا یہی وجہ ہے کہ دنیائے غزل گوئی میں اُنکا سلسلہ شاعری بہت جلد ناپید ہو گیا لیکن جو کچھ ان سے نہوا وہ بامر الٰہی انکی اولاد سے ظاہر ہوا۔ اور اس شان سے ظاہر ہوا کہ اُنکے پوتے انیس مونس۔ انس۔ اُردو زبان کی ایک صنف کے موجد قرار پائے۔ اور فن مرثیہ گوئی

---

۵ سبز عمامہ اور بڑا جبہ میر ضاحک کی خاص وضع تھی۔ ۶ تاریخ شعرائے اُردو از گارسن دتسی۔

کا ایک ایسا نمونہ چھوڑ گئے جسکے اس وقت ہزاروں پیرو موجود ہیں اور غالباً ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔

میر حسن کے چار بیٹوں میں سے تین شاعر تھے "میر مستحسن خلیق" "میر حسن خلق" "میر محسن محسن" ان سب کا قیام فیض آباد میں رہتا تھا چنانچہ خلیق و محسن بہو بیگم صاحبہ والدہ نواب آصف الدولہ کے داماد میرزا تقی کی سرکار سے متعلق تھے اور میر خلق داراب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے خلیق و خلق سے ایک ایک دیوان بھی یادگار ہے۔

تصانیف میر حسن کی تصانیف سے "دیوان حسن" مشتمل بر جملہ اقسام سخن اور مثنوی بدر منیر اس وقت تک موجود و مشہور ہیں۔ اگرچہ دیوان بہت کمیاب ہے تذکرہ شعرائے ریختہ نایاب ہے۔ اور یہی حال انکی اور دو مثنویوں کا بھی ہے ایک مثنوی میں شاہ مدار کی چھڑیوں کا حال لکھا ہے اس میں فیض آباد کی اور لکھنؤ کی ہجو لکھی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں کے جانے والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔

خاتمہ دہلی چھوڑنیکے بعد میر حسن فیض آباد اور بعد ازاں لکھنؤ میں جاکر مقیم ہوئے جہاں انہوں نے بڑی شہرت پائی اور نواب سالار جنگ اور نیز اُن کے بیٹے نواب مرزا نوازش علیخاں صفدر جنگ کی مصاحبت میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کی اور آخر کار وہیں عشرہ اول ماہ محرم سنہ ۱۲۰۱ ہجری میں بعہد نواب آصف الدولہ وفات پائی۔ اور عقب باغ نواب قاسم علی خاں واقع محلہ مفتی گنج میں مدفون ہوئے۔

انتقال کے وقت آپ کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ شیخ مصحفی نے شاعر شیریں زباں سے مادہ تاریخ نکالا۔

میر حسن کی شاعری

میر حسن کا طرز کلام زیادہ تر میر اور کمتر سودا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا نظر آتا ہے

بیان سے گو کرزبان کو دیکھئے تو وہ بھی انہیں دونوں بزرگوں کی سی ثابت ہوتی ہے فارسی ترکیبوں کے ترجمے ان کے غزلوں میں بھی دلپذیری کی اُسی شان میں نمودار پائے جاتے ہیں جس کا جلوہ سودا اور قائم کی سحر طرازیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دیکھتے ہی مے کو ساغر کا نہ کھینچا انتظار	مارے جلدی کے میں اپنا ہاتھ پیمانہ کیا
طرفہ تر یہ ہے کہ اپنا بھی نہ جانا اور یونہیں	اپنا اپنا کہہ کے مجھکو سب سے بیگانہ کیا

اصناف سخن میں سے میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہ تھے[۱]۔ البتہ غزل سرائی میں اُن کا صاحب امتیاز اور مثنوی گوئی میں یکتائے زمانہ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے جس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

میر حسن[۲] کی غزلوں کا رتبہ اُنکی مثنوی کے برابر بلند نہیں پھر بھی بقول صاحب آبحیات اُنکے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے چند اشعار بہ سبیل تذکرہ ملاحظہ ہوں۔

رو رو کے کیا ابتر سب کام مرے دل کا	کھویا مری آنکھوں نے آرام مرے دل کا
آغاز محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا	کیا جانئے کیا ہوگا انجام مرے دل کا
طوفان ہو زلفوں پر بہتان ہے کاکل پر	ہے رشتہ الفت ہی یہ دام مرے دل کا
جبتک میں جیا مجھکو قاصد نہ ملا آخر	اب جی ہی چلا لے کر پیغام مرے دل کا

معشوق کی الفت سے مت جان حسن خالی
لبریز محبت ہے یہ جام مرے دل کا

[۱] میر حسن نے قصیدہ کہا ہی نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدح سرائی کو ناپسند کرتے تھے (اشہری)

[۲] اکثر اساتذۂ فارسی کے کلام میں بھی ایک چیز خاص دیکھی جاتی ہے جو بات اسی شاعر کے دوسری تصنیف میں نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے فیضی کے نلدمن میں جو بات ہے وہ دیوان میں نہیں۔ فردوسی نے جو کام شاہنامہ میں کیا وہ یوسف زلیخا میں ان نہ پڑا (اشہری)

مزا ہے استقامت سے مثالِ شمع مرجانا		جہاں ثابت قدم رکھنا وہاں سر سے گذر جانا
کوئی دن کی ہیں مہماں اس چمن میں یکدن آخر		مثالِ نکہت گل شام جانا یا سحر جانا
دامنِ صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں		پانوں دیوانہ نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

میر خلیق

میر حسن کے چار صاحبزادوں میں تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیقؔ۔ میر احسن خلقؔ۔ میر محسن محسنؔ مگر میں صرف میر مستحسن خلیق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انکی تاریخ ولادت معلوم نہیں مگر تیرہویں صدی ہجری کے نصف اول میں انکا زور شور پایا جاتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں کہ میر خلیق نے فیض آباد اور لکھنؤ میں تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن شروع کی۔ ابتدا میں غزل کہتے اور والد بزرگوار سے اصلاح لیتے پھر میر حسن نے اپنے ہونہار فرزند میر خلیق کو شیخ مصحفی کے سپرد کر دیا اور شیخ صاحب اصلاح دینے لگے میر خلیق صاحب دیوان تھے مگر اُسے رواج نہیں دیا اور مرثیہ گوئی پر توجہ کی۔ سرمایہ مضامین جو بزرگوں سے ورثہ پہنچا تھا۔ اُسے زادِ آخرت میں صرف کیا اور اُس میں خاص نام پایا۔ اپنا کہا ہوا مرثیہ خود ہی مجلسوں میں پڑھتے تھے۔ قدردان آنکھوں سے لگا لگا کر لیجاتے تھے۔ میر خلیق کی مرثیہ گوئی سے پہلے اکثر مرثیے چومصرعے ہوا کرتے تھے۔ ہر چہار مصرعہ کے بعد قافیہ۔ وہ انداز موقوف ہوا۔ ایک سلام غزل کے انداز میں۔ اور مرثیہ کے لئے مسدس کا طریقہ آئین ہو گیا۔ وہ سوز اور تحت اللفظ دونو طرح پڑھا جاتا تھا۔ اور چونکہ سلام مستزاد کے اسلوب پر کہتے تھے وہ نوحہ کہلاتا تھا۔ اُسے سوز میں پڑھتے تھے۔ یہی طریقہ ابتک جاری ہے۔ اُس زمانہ میں "میر ضمیر" ایک مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے جو علوم عربیہ میں بھی استعداد کامل رکھتے تھے اور نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے وہ بھی غزل وغیرہ سے دست بردار

ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کو نقطہ مقابل کر کے تعریفیں شروع کر دیں طبیعتیں ایک دوسرے کی چوٹ پر زور آزمائی کر کے نئی نئی ایجاد پیدا کرنے لگے۔ اُس وقت مرثیہ ۳۰۔۴۰ حد ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ میر ضمیر مرحوم نے ایک مرثیہ لکھا۔

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

اس میں شہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان ہے۔ پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا پھر سراپا لکھا۔ پھر میدانِ جنگ کا نقشہ دکھایا۔ اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ چونکہ پہلا ایجاد تھا اس لئے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں۔ تمام شہر میں شہرہ ہو گیا۔ یہ ایجاد مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب تھا کہ پہلی روش متروک ہو گئی اور سب اس کی پیروی کرنے لگے۔

عہد مذکور میں چار مرثیہ گو نامی تھے میر ضمیر۔ میر خلیق۔ میاں دلگیر۔ میاں فصیح۔ میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی اس لئے مرثیہ خوانی نہ کرتے تھے۔ تصنیف میں بھی انہوں نے مرثیت کے دائرے سے قدم نہیں بڑھایا۔ مرزا فصیح حج و زیارت کو گئے اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کے لئے میدان خالی رہا کہ جولانیاں دکھائیں۔ دنیا کے تماشائی دونو استادوں کی تعریفیں کر کے لڑواتے تھے اور دونوں کی استادیوں کا لطف اُٹھاتے تھے مگر دونوں صاحب اخلاق اور سلامت روی کے قانون داں تھے کبھی ایک جلسہ میں جمع نہ ہوتے تھے آخر ایک صاحب نے ان دونوں کو ایک مجلس میں جمع کرنے کی تجویز نکالی۔

میر ضمیر اور میر خلیق کا ایک مجلس میں جمع ہونا

جب وہ تجویز قرار پا گئی نواب شرف الدولہ بہادر مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار دیکر سب خاص و عام کو اطلاع دی اور مجلس سے ایک دن پہلے میر ضمیر مرحوم کے مکان پر گئے اور گفتگوے معمولی کے بعد پانسو روپے کا توڑا سامنے رکھ دیا اور کہا کہ کل مجلس ہے مرثیہ

آپ پڑھیے گا۔ اس کے بعد میر خلیق کے یہاں گئے اُن سے بھی وہی مضمون ادا کیا۔ اور ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہ کی۔ روز معین پر ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ ایک بجے کے بعد میر ضمیر ممبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ چاروں طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کا شور بلند ہوا۔ اس میں میر خلیق بھی پہنچے۔ اور حالت موجودہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور دل میں کہا کہ آج کی شرم خدا کے ہاتھ ہے۔ میر ضمیر نے جب انہیں دیکھا تو اور زیادہ پھیلے اور مرثیہ کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں میں تحسین بلکہ وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی۔ آفتاب یوں ہی سا جھلکتا رہ گیا۔ وہ ابھی ممبر سے اترے ہی تھے کہ چوبداران کے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ آپ بھی حاضرین کو داخل حسنات فرمائیں اس وقت انکے طرف داروں کی بالکل صلاح نہ تھی مگر یہ تو کل بخدا اُٹھ کھڑے ہوئے اور ممبر پر جا بیٹھے چند ساعت توقف کیا اور دھیمی آواز سے چند رباعیاں پڑھیں پھر مرثیہ بھی اُسی دھیمی آواز سے شروع کیا۔ چند بند پڑھنے کے بعد دفعتاً بالکمال نے رنگ بدلا اور اسکے ساتھ ہی محفل کا بھی رنگ بدل گیا۔ آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا۔ اور نالہ وزاری نے آنسو برسانے شروع کئے پندرہ بیس بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ۲۵۔۳۰ بند پڑھکر اُتر آئے اہل مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے کہ جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ممبر خالی تھا نہ معلوم نہ ہوا کہ میر خلیق صاحب کس وقت ممبر سے اتر آئے۔ دونوں کے کمال پر نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ اور حاضرین کے طرف دار سرخرو گھروں کو پھرے۔

میر خلیق کا انداز بیان

میر خلیق کے کلام کا انداز۔ اور خوبی محاورہ۔ اور لطف زبان یہی سمجھ لو جو آج میر انیس کے مرثیوں میں دیکھتے ہو۔ میر خلیق کا پڑھنا بھی بے مثل تھا۔ اعضا کی حرکت سے بالکل کام نہ لیتے تھے۔ فقط نشست کا انداز اور آنکھ کی گردش تھی۔ اس میں سب کام ختم کر دیتے تھے

میر انیس مرحوم کو بھی میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ کہیں اتفاقاً ہی ہاتھ اُٹھ جاتا تھا۔ یا گردن کی ایک جنبش یا آنکھ کی گردش تھی جو کام کر جاتی تھی۔ ورنہ کلام ہی سارے مطالب کے حق پورے پورے ادا کر دیتا تھا۔

میر خلیق نے بڑھاپے کے سبب سے اخیر عمر میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا خود کہتے ہیں ؎

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا	دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا
گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب	باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

اِن کے گھرانے کی زبان سب کے نزدیک سند تھی۔ شیخ امام بخش ناسخ کہا کرتے تھے کہ زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے ہاں جایا کرو۔

میر خلیق کے تین صاحبزادے تھے۔ انیسؔ۔ مونسؔ۔ انسؔ۔

میر انیس کی پیدائش

میر مستحسن خلیق کو خدا نے ایک بیٹا عنایت کیا۔ جو ابھی ایک ستارہ ہی لیکن آگے چل کر شاعری کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا۔ اور امام علیہ السلام کی خدمات سے اپنے فرجد "امامی ہروی" کا نام روشن کرنیوالا ہوگا۔

اُس وقت میر خلیق کی حالت معمولی طور کی تھی۔ فیض آباد میں تھے اور کبھی کبھی لکھنؤ تشریف لایا کرتے تھے۔ صاحبزادے کے پیدا ہوتے ہی کاشانۂ سیادت روشن ہوگیا اور گھر میں ایک نئی دولت کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ضروریات خانگی میں بھی غیر متوقع سہولتیں پیدا ہوگئیں اور ایک باطنی روح مشکلکشائی کو آمادہ پائی جانے لگی۔ صورت کا رعب داب دیکھکر **ببر علی** نام رکھا گیا۔

اس موقع پر سب سے زیادہ ضروری صاحبزادہ کے سال ولادت کا ظاہر کرنا ہے لیکن افسوس کہ جیسے امامی ہروی میر رضا حک۔ میر حسن۔ میر خلیق کی پیدائش اور وفات کی صحیح تاریخ اور ماہ

سال کا پتہ نہیں ملتا۔ صرف میر حسن کی تاریخ وفات معلوم ہوئی ہے جو شیخ مصحفی نے لکھی ویسے ہی اس صاحبزادہ گرامی کا سال ولادت بھی نہیں ہوا۔ جو تذکرہ نہیں لکھا جاتا۔ اور تو اور مولانا محمد حسین صاحب آزاد مصنف آبحیات جیسے محقق کی تحقیق میں بھی اسکا پتہ نہیں ملتا۔

میر خلیق نے صاحبزادہ گرامی کی تعلیم و تربیت کا وہیں فیض آباد میں بندوبست کیا اور خود انکے خاندان کی تعلیم و تربیت پر پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں شاعری کا شوق ہوا۔ شفیق اور لایق باپ نے انیس تخلص تجویز کیا۔ پھر صاحبزادہ کو غفوان شباب میں لیکر لکھنؤ تشریف لائے۔ میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اور ۱۲۹۱ھ ہجری میں رحلت فرمائی اس حساب سے ۱۲۱۹ھ یا اسکے قریب قریب زمانہ پیدائش معلوم ہوتا ہے جو قمری حساب سے سمجھنا چاہیئے ورنہ شمسی حساب سے ڈھائی برس اور کم ہو جائیں گے۔ ۵۶۔ ۵۷ برس مشق سخن میں گزرے۔

میر انیس کی تعلیم

میر انیس کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی جب لکھنؤ تشریف لائے تو یہاں اپنی پرائیویٹ تعلیم کو جاری رکھا اور چالیس برس کی عمر تک مطالعہ کتب سے بے نیاز ہوئے لکھنؤ میں میر انیس کو عالمانہ درجہ میں تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن انکی معلومات علمیہ کا سب کو اقرار ہے۔ علی محمد خاں صاحب شاہ رئیس عظیم آباد اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میر صاحب کا مذاق علمی اس درجہ کو پہنچا ہوا تھا جو شاعری کی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہو جو ایسے مستند استاد کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ چنانچہ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب سدرہ کی ایک عبارت پر بحث کر رہے تھے اور میر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے وہ آواز میر صاحب کے کان میں پڑگئی۔ میر صاحب نے فرمایا کیا بحث ہے انہوں نے ادب سے سامنے آکر وہ مقام پیش کیا۔ میر صاحب نے دیکھا بھی نہیں اور زبانی وہ عبارت پڑھکر اس

مسئلہ کو اپنے لاثانی حسن بیان سے اس خوبی کے ساتھ حل کیا کہ ہم سب سنکر دنگ ہو گئے

میر صاحب کو بہ نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی اور اکثر میر صاحب کے زیر مطالعہ وہی کتابیں رہتی تھیں جو اپنا مثل نہیں رکھتیں اور عام دلچسپی کی مستحق ہیں۔

میر صاحب کی مختصر لائبریری میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں جمع تھیں جو سب کی سب انکی نظر سے گزر چکی تھیں۔

میر صاحب کے پاس اکثر اعلیٰ درجہ کے علماء ادبا اور مستند باکمال تشریف لاتے تھے اور میر صاحب ہر ایک سے انکے درجہ و مقام کے موافق گفتگو فرماتے تھے۔

میر انیس کی تربیت

میر انیس کے گھر اور خاندان میں ہندوستان کی شاہی فیملی کے طرز و انداز اور ایران کی طرز معاشرت اور شریفانہ اخلاق و آداب کے مکمل نمونے جمع ہو گئے تھے جو بوڑھوں سے جوانوں اور جوانوں سے لڑکوں بچوں کو مسلسل طور سے پہنچے تھے اور انکی آنکھوں نے دلی لکھنؤ فیض آباد میں ہر طرح کی حسن معاشرت اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے اخلاق و ادب کو دیکھ کر خود کو اعلیٰ تہذیب کا بہترین نمونہ بنا رکھا تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اخلاق شرافت اور آداب نفاست سے واقف اور اسکی پابند تھیں۔ چنانچہ میر محمد رضا رضی تاریخ[1] تاج الخواتین میں لکھتے ہیں کہ میر خلیق کی پاکدامن بی بی (یعنی میر انیس کی والدہ ماجدہ) مسائل مذہب اثنا عشری سے واقف تھیں اور فارسی اتنی جانتی تھیں جو جامع عباسی کو پڑھ لیتیں اور پڑھا دیتی تھیں وہ نماز روزہ کی پابند اور انتہا سے زیادہ پرہیزگار تھیں وہ ہر بات کو مذہب امامیہ

[1] یہ تاریخ بیگمات اودھ خواتین لکھنؤ اور فیض آباد کی ہے جس میں بہو بیگم اور جناب عالیہ اور بیگم صاحبہ مادر برجیس قدر وغیرہ کے حالات ہیں جنکی فیاضی اور اولوالعزمی پر لکھنؤ فخر کر سکتا ہے اُنکے ساتھ اُس زمانہ کی لائق یا انکی ہم صحبت شریف خواتین کا بھی ذکر ہے۔

اثنا عشریہ کے موافق کرنا چاہتی تھیں۔ اُنکی وضع اُن کا لباس اُن کی رفتار و گفتار دوسری بیبیوں کے لئے شریفانہ وضع کا مستند نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ بڑی بڑی امرا زادیاں اور بیگمات اُنسے ملنے کی خواہشمند رہتی تھیں لیکن دخل کیا جو وہ بغیر کسی تقریب و طلب کے گھر سے باہر جائیں وہ خود کو ہر باب میں پابند ادب رکھنا پسند کرتی تھیں اور اُنکو اخلاق رزیلہ اور سوء ادبی سے سخت نفرت تھی۔

پس میں کہتا ہوں کہ میر انیس کو اعلےٰ تربیت کا ابتدائی عملی حصہ جو اپنی مادر محترم کی ترتیب و تادیب سے حاصل ہوا وہ خاص قسم کا ہے جو بڑے سے بڑے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

میر انیس کی تعلیم و تربیت کے لئے خود اونکا گھر اور اُنکا خاندان ایک نہایت قابل قدر کالج کے بورڈنگ ہوس سے بہتر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اُسکے بعد عنفوان شباب میں لکھنؤ کا قیام جبکہ خود لکھنؤ کے وضیع و شریف ہر باب میں اعلیٰ تہذیب کا نمونہ بن رہے تھے اور یہاں کے ادنیٰ و اعلیٰ میں خودداری کی روح پھونکی ہوئی تھی اور بازار سے لیکر دربار تک پسندیدہ اخلاق و ادب کی پاسداری کی جاتی تھی اور سیکڑوں امیروں کی ڈیوڑھیاں مرجع ادب نظر آتی تھیں۔ میر انیس جیسے نقاد و خوش فکر کیلئے کیسا لاثانی جولانگاہ ہو سکتا ہے ناظرین خود اندازہ کر لیں۔ میر انیس کو یہاں جیسے علما و ادبا اور امرا و زرا کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور عام مجالس میں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کے اجتماع سے جو ایک خاص قسم کا غیر معمولی اکتساب میر انیس کے دل اور دماغ نے کیا وہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ناممکن ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میر انیس اور فنون سپہگری

دلی میں میر کاظم علی سفید پوش۔ پٹہ۔ بانک۔ بنوٹ کے اُستاد تھے۔ مگر جب دلی کے اہل کمال باہر جانے پر مجبور ہوئے تو میر کاظم علی لکھنؤ میں تشریف لائے اور میر خلیق کے مکان کے پاس مکان لیا۔ اس سے پہلے دونوں خاندان دلی میں بھی ایک دوسرے سے تعارف رکھتے تھے اور میر انیس نے امراز اور گان فیض آباد کے ساتھ اور اپنے ذاتی شوق سے ایک حد تک شہسواری اور سیف زنی کی مشق کی تھی اور طبیعت میں اُس کا شوق باقی تھا۔ اس لئے میر خلیق نے میر کاظم علی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ میرے لڑکے کو کچھ بتا دیا کریں۔ میر کاظم علی نے بہت خوشی سے اُس کو منظور کیا۔ لیکن وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے اس لئے اُنہوں نے اپنے بیٹے میر امیر علی کو اس کام پر مامور کر دیا میر انیس نے علی مد لکڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی کچھ گھائیاں اُن سے سیکھیں یہانتک کہ وہ اس باب میں بہت بڑی صفائی اور چابکدستی ظاہر کرنے لگے بلکہ کسی کسی کام میں میر امیر علی پر چوٹ کر جاتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کی بھاگڑ میں میر امیر علی بی بی بچوں کو لیکر بنارس چلے گئے وہاں سے حیدر آباد جانے کا قصد کیا۔ درمیان میں نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ سابق ریاست بھوپال کے حضور میں رسائی ہوئی۔ مردم شناس رئیسہ نے میر امیر علی کی شریفانہ وضع اور قابل دربار صورت دیکھکر اُنکو روک لیا اور بعد چند سال جب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ (جواب والیہ ریاست ہیں) نو دس برس کی ہوئیں تو اُن کو لکڑی سکھانے پر مامور کر دیا بھوپال میں میر امیر علی کئی برس تک میرے ہم محلہ رہے ہیں وہ اکثر میر انیس کے حالات بیان کرتے رہتے تھے۔

میر امیر علی کہتے تھے کہ میر انیس کو اُس عمر اور اُس حالت میں بھی اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی خودداری کا اتنا خیال رہتا تھا کہ میں نے کبھی میر انیس کو ننگا نہیں دیکھا اور نہ وہ

ننگے بدن مشق فن کرتے تھے بلکہ اُس کے مناسب کپڑے بنائے تھے اور بالاخانہ کی چھت پر مشق کرتے تھے جہاں میرے اور اُنکے سوائے دوسرا نہ ہوتا تھا اُنکا قول تھا کہ اگر میرانیس کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں مدد شاہی یا بھوپال کے چار پیسے والا پیسہ بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے اور اُنکی چوٹ کو بنوٹ جاننے والے کے سوائے کوئی روک نہ سکتا تھا۔

میرانیس اور ورزش

میرانیس کے خاندان میں عام طور سے ورزش کا چرچا تھا۔ اور میرانیس نے تو تمام عمر اس کی پابندی کی۔ میر صاحب ایک علاحدہ کمرہ میں ورزش کرتے تھے جہاں دوسرا کوئی نہ جا سکتا تھا۔ میر صاحب کی ورزش معتدل ہوا کرتی تھی جو حفظ صحت اور تنومندی کے لئے ہر وقت کے مناسب حال تھی۔ نہ اتنی کم جس کا اثر محسوس نہ ہو نہ اتنی زیادہ جو پہلوان کی طرح پسینے پسینے کر ڈالے۔ ڈنڑ فرش پر کرتے تھے جو عموماً پچاس ساٹھ کی تعداد میں ہوتے اور سو دو سو ہاتھ مگدر کے ہلاتے۔ اور اپنے جسمانی بناؤ سدھار کا خاص خیال رکھتے۔ آخر میں ورزش گھٹ گئی تھی اس پر بھی کہتے ہیں کہ چند ڈنڑ کرنا اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر کے ہلانا موقوف نہیں ہوا۔

میرانیس کی خلوت

میرانیس کو اپنی خودداری کا بہت بڑا خیال رہتا تھا اسلئے مخصوص اوقات میں وہ اپنے خلوتخانہ میں تشریف لیجاتے۔ اور اندر سے دروازہ کی زنجیر بند کر لیتے تاکہ کوئی ایک لڑکا تک

لہ یہی وجہ ہے کہ میرانیس جن مقامات پر میدان جنگ میں مبارزوں کے فنون جنگ اور ایکدوسرے کے داؤں پیچ اور نیزہ بازی وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں تو اُسکی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو بغیر معلومات فن کے ناممکن ہے (اشہری)

اندر نہ آئے۔ یہاں بے تکلف ہو کر بیٹھتے کبھی ٹہلنے لگتے۔ کبھی دوسرے شغل سے جی بہلاتے اس مکان میں ایک حوض بھی ہے۔ اکثر موسم گرما میں اوس میں غوطے لگاتے اکثر اسی حالت خلوت میں دس دس بیس بیس پچاس پچاس بند کہہ ڈالتے جو اُن کے لوح حافظہ پر لکھ جاتے۔ اور جب باہر تشریف لاتے تو میر مونس یا میر نفیس یا اور کسی عزیز و شاگرد سے جو حاضر ہوتا لکھنے کا ارشاد کرتے اور مسلسل لکھوا دیتے۔

میر انیس کا دربار

ہر چند طبقہ شعرا میں شہزادہ علی حزیں۔ اور میر تقی میر۔ اور شیخ امام بخش ناسخ وغیرہ کی نازک دماغیاں مشہور ہیں لیکن میر انیس اعلی اللہ مقامہ کی تمکین و خودداری نے اُنکے رکھ رکھاؤ میں ایک شاہانہ حالت پیدا کر دی تھی جو ایک ایسے عالی دماغ اور بادشاہ اقلیم سخن کے لئے زیبا ہو سکتی ہے۔ انکی ہر بات ایک قاعدہ کی پابند تھی۔ اُنکے اخلاق و آداب اور معاشرت کا دستور العمل جیسے اُن کی اپنی ذات سے ہر دفعہ کی پابندی کراتا تھا ویسے ہی دوسرے کو حد ادب سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا میں نے جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا اور نواب بدھن صاحب جیسے اکابر لکھنؤ سے سُنا ہے کہ میر صاحب تک پہنچنے اور اُن سے ہمکلام ہونیکے لئے درباری قسم کے چند قواعد کی پابندی لازم تھی۔ کوئی یوں بے تکلف سامنے نہ جا سکتا تھا جب تک میر صاحب اُسکے آنے کی اجازت نہ دیں۔ یا ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے روزمرہ کے آنے جانیوالے بھی ایک اطلاع کے بعد باریاب ہوتے تھے۔ اور جب میر صاحب باہر تشریف رکھتے تھے تو اپنی وضع کے پورے لباس میں زیب افزائے صدر نظر آتے تھے اُن کی معمولی باتوں میں بھی اُدائے کلام سے اعجاز فصاحت کا اثر ظاہر ہوتا تھا۔ اور وہ معجز بیانی اُنکا حصہ تھی جو دوسری جگہ نہ مل سکتی تھی اور اُن پر ختم ہو گئی جس کو اُن کے دیکھنے والے آج تک یاد کرتے اور نہ دیکھنے والوں کو محو حیرت

بناتے ہیں اور میر انیس جس دن سے لکھنؤ تشریف لائے بغیر پنیس کے بہت کم باہر نکلے جو پچھلے زمانہ میں امیرانہ سواری تھی اور اکثر ثقات شہر اسی پر سوار ہوتے تھے

میر انیس کی حسن پرستی

میر انیس کی طبیعت حسن پرست واقع ہوئی تھی جو ایک ایسے شاعر کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ اگر وہ صفت نہ ہو تو ایسا شاعر بن ہی نہیں سکتا۔ میر صاحب کو ایک اچھے پھول کا دیکھ لینا اُن کے وجدان کی تحریک کا ذریعہ ہو جاتا تھا۔ میر صاحب جمادات نباتات حیوانات میں محاسن قدرت کا نظارہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے۔ یہی وجدان ہے جو جا بجا انکی تصنیف سے رنگ گل بنکر پھوٹا نکلتا ہے۔ اسی وجدان نے انکو مناظر قدرت کے پُر بہار وادی میں ہر برگ و گل کو دیکھ کر لفظوں میں اُس کی تصویر اتارنے سے بہزاد و مانی پر فایق کر دیا ہے۔

میر انیس کی شکل و صورت

(۱) میر انیس کا قد لانبا۔ چھریرا۔ متناسب الاعضا رتھا۔

(۲) سر کے بال باریک اور ملایم۔

(۳) چہرہ خوبصورت و کتابی۔

(۴) رنگ کھلا ہوا گندمی۔

(۵) آنکھیں بڑی بڑی۔ خوبصورت جنکی خوش آب سفیدی نرگس کا لطف دیتی تھی۔ آنکھوں کے تیور سے غیورانہ حالت ظاہر ہوتی تھی۔ پتلی کی روشنی بہت تیز تھی۔

(۶) موچھیں بڑی بڑی افگندہ مو۔ ڈاڑھی صاف۔

(۷) گردن صراحی دار۔ گردن فراز کے معنی ظاہر کرنے والی۔

(۸) سینہ کشادہ اور عریض مگر زیادہ اُبھرا ہوا نہیں۔
(۹) چال نہایت نستعلیق۔ دخل کیا جو پنے تلے قدم سے آگے بڑھ جائے۔

میر انیس کی وضع

میر انیس لکھنؤ میں اُس وقت تشریف لائے جبکہ درباری لباس ایک خاص تہذیب کا پابند تھا اور ثقات شہر نے اپنے لئے ایک خاص وضع اختیار کر رکھی تھی جو دلی کے بعد لکھنؤ کے لئے خاص سمجھی جاتی تھی اور اُس کو دیکھ کر لکھنؤ کی بود و باش کا امتیاز ہوتا اور وہ بالکل مشرقی لباس سے مرکب تھی۔ اس وقت میں میر صاحب نے اپنے لئے وہ لباس اختیار کیا جو آخر وقت تک اُن کے جسم پر موزوں رہا۔ اور اس درمیان میں لکھنؤ کی وضع میں کئی تغیرات ہوئے اور زبان نے بھی کئی رنگ بدلے لیکن میر انیس کی وضع ان کی زبان کی طرح وہی رہی جو پہلے تھی۔



میر انیس اپنے سر پر لکھنؤ کی سفیدی دار پیچ گوشہ ٹوپی اس صورت کی لگاتے تھے۔ اور ٹوپی کی درستی اور خوبصورتی سے لگانے میں انکو بڑی دلچسپی رہتی تھی جب وہ کہیں تشریف لیجاتے تو گولوں پر چڑھی ہوئی آٹھ دس ٹوپیاں حاضر کی جاتیں وہ جسکو پسند فرماتے اُسکو سر پر رکھتے اور آئینہ سامنے رکھ کر اُسکو بار بار درست کرتے۔ جبتک وہ صحیح موزونیت حاصل نہ کرتی وہ اس شغل سے باز نہ آتے۔ بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ ٹوپیوں کے تبدیل بدل اور اس شغل میں صرف ہو جاتا۔ آخر میں جب کوئی ٹوپی صحیح مقام حاصل کر لیتی تو پھر اُس مقام سے نہ ہٹاتے اور جبتک واپس آتے وہ ٹوپی اسی مقام پر اُسی شان سے قایم رہتی جسم میں ایک خاص وضع کا گھیر دار کرتہ پہنتے تھے۔ اور صرف یہی کرتہ انکی وضعداری کو خاص امتیاز سے ظاہر کرتا تھا کبھی گول پردہ کا انگرکھا زیب جسم فرماتے تھے۔ اور لکھنؤ کے عام رواج کے موافق غرارہ کا ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے پانوں میں لکھنؤ کی زرد مخملی جوتی شرف پابوس حاصل کرتی تھی ہاتھ میں پتلی چھڑی اور

سفید رومال ہوتا تھا۔

میر انیس کی پہلی مجلس

جن دنوں میر انیس لکھنؤ تشریف لیگئے تو لکھنؤ اپنے شباب کے مزے لے رہا تھا ایک طرف شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے مشاعروں سے شاعری کی دنیا گونج رہی تھی دوسری جانب میر ضمیر اور میر خلیق کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی تمام شہر میں دھوم تھی اور شیعہ پارٹی کے زن و مرد بلکہ بچہ بچہ کو اعلیٰ مرثیہ سننے کا شوق تھا۔ اس موقع پر میر خلیق چپکے چپکے اپنے صاحبزادہ میر انیس کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا عمدہ نمونہ بنانے پر متوجہ تھے اور خود میر انیس کا صحیح وجدان اس باغ میں ایک نئی بہار پیدا کرنیکے لئے آمادہ تھا۔

اس حالت میں میر انیس نے اکثر رباعیاں۔ متعدد سلام اور چند مرثیے تصنیف کر کے اپنے شفیق اور استاد باپ کو دکھائے۔ اور تحت لفظ پڑھنے میں بھی مکان کے اندر بیٹھ کر بہت کچھ مشق فن کر لی۔

میر خلیق خاص خاص مجلسوں میں میر انیس کو بھی ساتھ لیجاتے۔ یہ قریب ممبر کے بڑی تمکین و متانت سے بیٹھتے اور ختم مجلس تک اُسی شان سے بیٹھے رہتے۔ زانو بدلنا کیسا کوئی عضو بھی بقاعدہ حرکت نہ کرتا۔

میر انیس کی اس حُسن متانت سے ارباب مجلس کے دلوں میں ایک خاص گنجائش پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اور بعض نے میر خلیق سے صاحبزادہ کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے حالات دریافت کر کے انکی تصنیف اُنکی زبان سے سننے کی خواہش ظاہر کی۔ آخر کار ایک بہت بڑی مجلس میں میر خلیق نے مرثیہ پڑھا اور حسب معمول بے انتہا تعریف ہوئی اور مال مجلس بھی حاصل ہوا لیکن آواز کے ضعف نے ارباب مجلس کے دلوں پر ولولہ انگیز اثر نہ ڈالا جو ممکن ہے

کہ شفیق باپ نے خود اپنے بیٹے کے دل بڑھانے اور مجلس پر اپنے ہونہار فرزند کے جدید اثر کو نمایاں کرنے کی غرض سے اپنی آواز میں ضعف کے آثار پیدا کر لئے ہوں۔ یا فی الحقیقت ویسا ہی ہوا ہو۔ بہرحال مرثیہ ختم کرنے کے بعد میر خلیق نے ارباب مجلس کو متوجہ کر کے کہا کہ آپ صاحبوں نے اکثر میرے لڑکے کے سننے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے آج سُن لیں۔ یہ کہہ کر میر انیس کو اشارہ کیا وہ نہایت وقار و ادب سے اُٹھے اور میر خلیق ممبر کے دوسرے زینہ پر بیٹھتے تھے یہ اُس سے ایک درجہ بلند تیسرے زینہ پر بیٹھ گئے اور اس وقار اور خوبصورتی سے بیٹھے کہ تمام ارباب مجلس کی نگاہوں میں وہ خوبصورت ٹھاٹھ جم گیا اور میر انیس کا خوبصورت چہرہ اور موزونی بدن اور عنفوان شباب کی جوشیلی امنگ مل جُل کر ایک غیر معمولی اثر ظاہر کرنے لگی۔ پہلے میر صاحب ممبر پر نقش تصویر ہو کر چند منٹ چُپ بیٹھے رہے۔ پھر ایک رباعی پڑھی پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے ایک غیر معمولی لطف پیدا کیا اور چاروں طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر انیس نے ایک سلام پڑھ کر ساری مجلس کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ ازاں بعد مرثیہ شروع کیا تو رزم و بزم کی تصویر اس خوبی اور خوبصورتی سے دکھائی کہ اُسی وقت سے ہر دل پر میر صاحب کی فصاحت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اعجاز کلام اور انداز بیان سے کئی مرتبہ ارباب مجلس بیتاب ہوئے اور کئی مرتبہ جوش شجاعت اور انداز فصاحت کے بند سُن کر جھومنے لگے۔ قصہ مختصر میر انیس نے پرجوش تعریفوں کی گونجتی ہوئی آوازوں میں مرثیہ ختم کیا۔ سیکڑوں قدرشناس اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر میر انیس سے مصافحہ کرنے اور ہاتھ چومنے کو سامنے آئے اور تعریف کا سلسلہ دیر تک قایم رہا۔ پھر تو میر صاحب کی شہرت روز بروز بڑھنے لگی اور بڑے بڑے نواب و امیر۔ وزیر میر انیس کے زیب مجلس ہونے پر فخر کرنے لگے اور بہت جلد تمام شہر میں میر انیس میر انیس کی دھوم مچ گئی۔ اور بتدریج تمام ہندوستان میں اُنکا ڈنکا بجنے لگا۔ اور میر انیس کے ساتھ مرزا دبیر کی سخن آرائیاں بھی شہرت پذیر عام ہوئیں اور شہر کے خوش مذاق لوگوں نے

دونوں کو حریف مقابل قرار دے لیا۔ جیسے میدان تغزل میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش ایک دوسرے کے حریف مقابل تھے۔

شاہی مجلس

تمام شہر لکھنؤ میں میر انیس اور میرزا دبیر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نقادان سخن کے جتھے دونو کی طرفداری میں علاحدہ علاحدہ بٹے ہوئے تھے۔ ہر گروہ اپنے مقتدیٰ کی طرفداری پر زور دیتا تھا۔ کسی ایک مجلس میں دونوں صاحبوں کا جمع ہونا اتنا مشکل تھا جو بغیر خاص تدبیر اور اثر کے ناممکن تھا لیکن لکھنؤ کے حضرات دونو کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے چنانچہ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جانعالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کر کے ایسی تقریر کی جس سے بادشاہ دونوں کو ایک مجلس میں پڑھنے کا ارشاد فرمائیں اور بادشاہ نے ایسا ہی کیا اُس پر مفتاح الدولہ خود دونو صاحبوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی پیغام پہنچایا۔ دونو صاحبوں نے قبول کر لیا۔ روز وقت معینہ پر پہلے میرزا دبیر پہنچے۔ اور باریاب حضوری ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر انیس نے ہر بات کی خبر پہنچنے کا انتظام کر رکھا تھا جب یہ حال معلوم ہوا کہ میرزا دبیر پہنچ گئے تو اپنے جانے میں دیر لگانا شروع کی۔ یہانتک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی۔ اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپکا انتظار ہے میر صاحب تیار تو تھے ہی اور فنس سامنے حاضر تھی اُس پر بیٹھکر روانہ ہوئے۔ مجلس میں فرش پر پانوں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب نہایت تمکنت اور وقار سے سیدھے ممبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدۂ مقررہ کے موافق ممبر کے پاس بیٹھ گئے۔ نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو اُنسے کہا کہ آپ حضرت جان عالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے

اطلاع کی۔ بادشاہ نے اپنی خوشنودی مزاج کا اظہار کیا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر انیس نے اس موقع پر بھی اپنی خودداری کا کیسا خیال رکھا ہے آخر کار مجلس شروع ہوئی پہلے میرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اُنہوں نے پڑھا بادشاہ کی تعریف میں بھی ایک رباعی پڑھی سامعین نے بڑی دلچسپی سے سُنا۔ اور واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازوں سے عالی شان کمرہ گونجنے لگا۔ مال مجلس بھی حاصل ہوا اُنکے بعد میر انیس کو پڑھنے کا ارشاد ہوا۔ میر صاحب کچھ لیکر نہ گئے تھے میر مونس سے پوچھا کچھ لائے ہو اُنہوں نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا اُس کو دیکھا اور فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کیا اور ممبر پر تشریف لے گئے۔ میر مونس کا سلام اُس وقت کے مشاعرہ کی طرح پر تھا جس کا ردیف وقافیہ یہ ہے گلستاں ہوکر بیاباں ہوکر ممبر پر جاکر اپنی عادت کے موافق تھوڑی دیر چُپ بیٹھے رہے۔ جب تمام مجلس اُن کی طرف متوجہ ہوئی تو جناب امیرؑ کی مدح میں ایک رباعی پڑھی۔ چاروں طرف سے آفریں و مرحبا کا شور بلند ہوا ازاں بعد سلام شروع کیا جس کا وہ فی البدیہہ مطلع یہ ہے۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہوکر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہوکر

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتیں ادائے کلام کے مزے لینے لگیں اور میر انیس کے انداز بیان نے تمام درباری لوگوں کو سمجھا دیا کہ ہم اس موقع پر بھی اپنے درجہ کمال سے نیچے اُترنے والے نہیں سلام ختم کرکے میر صاحب نے مرثیہ کے چند بند پڑھے جس سے اہل مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی۔ اور رزم و بزم دونوں کا حق ادا کرکے ممبر سے اُترے۔ میر صاحب کے اشارات کو بادشاہ بھی سمجھ گئے جو ممبر کے عقب میں شہ نشین پر تشریف رکھتے تھے۔ اور نواب مفتاح الدولہ اور حاضرین سے میر انیس کے سلام کے متعلق کہا کہ اس زمین میں ہم نے بھی سلام لکھا ہے دونوں کا انداز بیان یکساں معلوم ہوتا ہے حاضرین نے کہا جی پیر و مرشد کیوں نہیں پھر میر انیس کو سامنے یاد فرماکر تعریف کی۔ میر صاحب آداب بجالاکر

رخصت ہوئے تمام شہر میں اس مجلس کا شہرہ ہوگیا اور مہینوں اُسکا ذکر ہوتا رہا۔ میں نے یہ حال نواب بدھن صاحب کی زبانی سُن کر قلمبند کیا۔

مجلس عظیم آباد

میر صاحب عظیم آباد تشریف لیجایا کرتے تھے مگر ایک سال کسی سبب سے نہ جاسکے تو سال آیندہ کے لئے خاص اہتمام کیا گیا۔ قدرشناس و حوصلہ مند نواب نے کلکتہ۔ بہار۔ مرشد آباد۔ بنارس۔ الہ آباد وغیرہ کو استہتاری خط روانہ کئے تاکہ انکے سب مشتاق اور اس فن سے دلچسپی رکھنے والے وقت مقررہ پر تشریف لاکر شریک مجالس ہوں۔ چنانچہ روز مقررہ پر چار و نطرف سے بڑے بڑے رئیس و امیر اور ارباب علم و کمال میر صاحب کو دیکھنے اور سننے کے لئے وہاں پہنچ گئے اور تمام شہر عظیم آباد کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ کثرت سے شریک مجلس ہوئے۔ ہزاروں آدمی کا مجمع تھا۔ اور زیادہ تر ہر فرقہ کے چیدہ اور منتخب لوگ شریک تھے۔ نو بجے سے مجلس شروع ہوئی۔ سوز خوانی کے بعد دو ڈھائی گھنٹے تک میر مونس نے ممبر پر تحت لفظ مرثیہ پڑھا۔ کئی مرتبہ اہل مجلس جوش گریہ سے بیتاب نظر آئے کئی مرتبہ زمیہ بندوں پر جھومنے لگے۔ بند بند پہ واہ واہ کے شور سے عالی شان مکان گونج جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ ایک مرثیہ خواں کا جو کمال ہونا چاہیے وہ میر مونس نے ظاہر کر دیا۔ اب اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ اسکے بعد میر انیس کا نمبر آیا تو سب ارباب مجلس زانو بدل بدل کر انکی سُننے کے مشتاق ہوئے۔ اور مجلس نہایت ذی رتبہ اور قابل قدر سامعین سے ایسی بھری ہوئی تھی کہ بہت کم ایسی مجلس جمع کی جاسکتی ہے اور ایک مرثیہ خواں ایسی مجلس کو اپنی کامیابی کا بہترین ذریعہ خیال کرتا ہے۔ لیکن میر صاحب کی دُھن کو دیکھئے کہ جب میر مونس ممبر سے اُترے اور میر انیس تشریف لے گئے تو ممبر پر تھوڑی دیر چُپ بیٹھے رہنے کے بعد جب ارباب مجلس آمادہ سماعت ہوئے تو کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ

صاحبو۔ مجلس کو بہت طول ہوگیا۔ اور غالباً آپ سب صاحب میر مونس کو سنکر سیر ہوگئے ہونگے اور اب فریضۂ ظہر کا وقت آگیا۔ میں نماز پڑھ لینا چاہتا ہوں جسکو جناب سید الشہدا نے تلوار وں کی دھاروں میں ادا فرمایا ہے۔ آپ بھی نماز سے فارغ ہولیں۔ پھر جن صاحبوں کو انیس کا سُننا ہو وہ تشریف لائیں اور جو میر مونس کو سنکر سیر ہو چکے وہ اپنے گھروں میں آرام فرمائیں اس کو سنکر ایک عام مایوسی کی صورت ظاہر ہوئی۔ اور میر صاحب نماز پڑھنے کو تشریف لیچلے جنکو دیکھکر تمام ارباب مجلس اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور وہ عالی شان مجمع برخاست ہوگیا۔ بعض صاحبوں کو سخت افسوس ہوا کہ جناب میر صاحب نے ایسی بھری مجلس کو کیسا پھیکا کر دیا جواب جمع ہونا دشوار ہوگا۔ لیکن ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ اُن صاحبوں نے پھر معاودت فرمائی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لیتے آئے جو اس سے پہلے شریک نہ تھے اس طرح پر وہ مجلس پیشتر سے زیادہ کھچا کھچ بھر گئی جسکو دیکھکر بانی مجلس بے انتہا خوش ہو رہے تھے جب میر صاحب کو خبر ہوئی کہ مجلس تیار ہے تو خراماں خراماں تشریف لائے اور ممبر پر جاکر سر اٹھایا اور پیشتر سے زیادہ بھری ہوئی مجلس کو دیکھکر کہا کہ ؎

حضرات۔ مجھ کو اس کا اندازہ کرنا مقصود تھا کہ انیس کے دیکھنے والے کتنے ہیں۔ الحمد للہ کہ آپ صاحبوں نے میری قدردانی کا ثبوت دیا۔ یہ کہہ کر ساری مجلس کو اپنا گرویدہ کرلیا اور دو چار رباعیاں اور ایک سلام پڑھکر یہ مرثیہ شروع کیا۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے — جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے — مڑکر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

اس مرثیہ کے مسجع بندوں نے سخن شناس طبائع پر جو اثر کیا اُس کا بیان نہیں ہوسکتا رزمیہ بندوں کے ہر شعر پر واہ واہ سبحان اللہ کی پرجوش آوازوں سے تمام مکان گونج

رہا تھا۔ اور رنج والم کے جانکاہ بندوں پر دلوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں میر صاحب نے کئی مرتبہ چاہا کہ اب مرثیہ ختم کریں لیکن ساری مجلس کے اصرار اور بڑے بڑے امرا و رؤسا کے بیقرار دلوں اور اُنکی عام خواہشوں نے جبتک پورا مرثیہ ایک ایک بند کرکے سُن نہ لیا اُنکا میر سے اُترنا قبول نہ کیا۔ بلکہ اکثر اصحاب مقطع کا بند سُنکر مایوس ہوئے کہ ابھی کیوں یہ مرثیہ ختم ہوگیا۔ اور کیوں میر صاحب کی معجز بیانیونکے لطف مزید کا موقع باقی نرہا

مجلس حیدرآباد

نواب تہور جنگ بہادر نے میر انیس کو طلب فرمایا۔ یہ طلبی درحقیقت نواب سر سالار جنگ محمد تراب علی خان بہادر مرحوم مدار المہام سلطنت آصفیہ حیدرآباد کی طرف سے تھی۔ کئی معتبر لوگوں نے جو اس مجلس میں شریک تھے مجھ سے بیان کیا کہ اس مجلس میں حیدرآباد کے تمام امرا اور شرفا اور ہر فرقہ اور ہر درجہ اور ہر طبقہ کے ہندو مسلمان سُنی شیعہ لوگ شریک تھے۔ اور عوام کی تو وہ کثرت تھی کہ عالی شان مکان کے دالانوں اور صحن زیر شامیانہ کے اطراف کھڑے ہونیکی بھی جگہ نہ مل سکتی تھی۔ ہزاروں آدمی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور ایک جم غفیر باہر کھڑا ہوا تھا جس کو اندر جانیکے لئے سانس نہ ملتی تھی اور میر انیس کو سُن کر تمام ارباب مجلس مہینوں اُنکا ذکر کرتے اور اُنکے طرز بیان کو یاد کرکے اُسکے مزے لیتے رہے۔ رخصت کے وقت نواب سر سالار جنگ نے سات ہزار اور نواب تہور جنگ نے تین ہزار روپے پیش کئے۔ اور آمد و رفت کا خرچ علیحدہ دیا گیا۔ اس مجلس کی شہرت ہونے کے بعد حیدرآباد کے سب سے زیادہ دولتمند اور سب سے اول درجہ کے امیر نواب سر آسمانجاہ بہادر نے چاہا کہ اگر میر انیس اپنی ٹوپی کی جگہ حیدرآباد کی منصبداری پگڑی رکھکر مرثیہ پڑھیں تو میں اُن کو سننا چاہتا ہوں اور پانچہزار روپیہ پیش کیا جائے گا۔ بعض دس ہزار کی تعداد بیان کرتے ہیں لیکن میر انیس نے اپنی ٹوپی اتار کر حیدرآباد کی پگڑی رکھنا قبول نہ کیا۔

الہ آباد کی مجلس

جب میر انیس الہ آباد تشریف لے گئے تو روز اور وقت مقررہ پر شریک ہونیکے لئے اشتہار شائع کر دیئے گئے تھے۔ اُس روز سے ایک دن پہلے طلبار کے عام شوق کو دیکھ کر کالج میں ایک روز کی تعطیل منظور کی گئی اور تمام کچہریوں میں اہل عملہ کو شرکت مجلس کی اجازت دی گئی تھی۔ اور قریب قریب ہر فرقہ و مذہب کے اعلیٰ عہدہ داروں نے شریک مجلس ہونیکے لئے اپنے افسران سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ اس لئے مجموعی طور پر اس عالی شان مجلس میں اس کثرت سے آدمی آئے اور ایسے منتخب لوگ شریک ہوئے تھے جو عام تقریبات میں اس سے پہلے ایک جگہ جمع ہوتے نہیں دیکھے گئے۔

شمس العلمار مولوی ذکار اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی کالج الہ آباد بیان کرتے ہیں کہ جب میں اس مجلس میں پہنچا تو تمام عالی شان مکان آدمیوں سے بھر چکا تھا۔ بلکہ سیکڑوں مشتاق فرش کے کنارے زمین پر دھوپ میں کھڑے ہوئے محو سماعت تھے۔ جب میں پہنچا تو مرثیہ شروع ہو چکا تھا اور میرا مجلس کے اندر جگہ پانا ناممکن تھا۔ اس لئے میں بھی وہیں دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے اور دور سے ٹکٹکی باندھ کر میر انیس کی صورت اور اُن کے ادائے بیان کو دیکھنے لگا۔ میں میر انیس کی فصاحت بیانی اور اُن کے طرز بیان کی دلفریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سُنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق العادت اثر پیدا ہوتے مشاہدہ کیا میر انیس بوڑھے ہو گئے تھے مگر اُنکا طرز بیان جوانوں کو مات کرتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ممبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے۔ جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے اور جب چاہتی ہے ہنساتی ہے اور جب چاہتی ہے رُلاتی ہے۔ میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے

سے تر اور پاؤں خون اُترنے سے شل ہو گئے لیکن میں جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا اور اُن کا مرثیہ سُنتا رہا مجکو یہ کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ دلچسپی اور محویت کیا ہو گی

شیش محل لکھنؤ میں میر انیس کی آخری مجلس

میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی۔ چھپن ستاون برس مشق فن میں گزرے۔ جوں جوں وہ بوڑھے ہوتے گئے اُنکی شاعری جوان ہوتی گئی اور زمانے نے اول سے آخر تک اُن کا احترام کیا۔ اُنھوں نے سیکڑوں مجلسیں پڑہیں اور ہمیشہ ارباب مجلس کی واہ واہ اور سبحان اللہ کی پُرجوش آوازوں کی گونج میں منبر سے اُترے۔ کہتے ہیں کہ میر صاحب مرحوم اعلی اللہ مقامہ نے آخری مجلس نواب باقر علی خاں صاحب و نواب جعفر علی خاں صاحب کے شیش محل واقع لکھنؤ میں پڑھی۔ اس کے بعد پھر کسی بڑی مجلس میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس مجلس میں جو مرثیہ آخری مرتبہ پڑہا وہ یہ تھا ؎

آتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج

رحلت

میر انیس مرحوم نے ایک مہینہ تپ دق کے مرض میں مبتلا رہ کر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو بروز دوشنبہ اپنے مکان واقع چوبداری محلہ میں دنیائے فانی سے رحلت فرمائی مرزا دبیر نے تاریخ کہی :-

طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

میر انیس کی تصنیف کی مقدار

میر انیس کے تذکرہ میں اس بات کا بتانا ضرور ہے کہ اُن کی تصنیف کی مقدار کیا ہے یعنی اُنہوں نے تمام عمر میں کتنے شعر کہے ہوں گے اس کی صورت یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی ستر برس کی عمر میں پچپن سال اس شغل میں صرف کئے اور اُن کو روز و شب اسی شغل سے کام رہا۔ اُن کی تصنیف کی صحیح تعداد بتانا ممکن نہیں حتیٰ کہ خود اُن کے پوتے اور نواسے اس تعداد کو صحیح مقدار میں نہیں بتا سکتے۔ اور خود میر انیس نے صحیح مقدار کی کوئی یادداشت نہیں چھوڑی لیکن اُنکی کثرت تصنیف کی نسبت عام مشاہدہ کی شہادت پر بہت کچھ اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے پچپن سال اس شغل میں بسر کئے۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب آزاد تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں۔

"میر انیس مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔ اور سلاموں کا تو کیا شمار ہے۔ رباعیاں تو باتیں تھیں۔"

اب میں تعداد اشعار کی ایک مقدار قرار دیتا ہوں۔ میں نے لکھنو جا کر اس کی تحقیق کو خاص ذرائع اختیار کئے۔ اور کئی معتبر شہادتوں سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُن کی مقدار تصنیف ڈھائی لاکھ اشعار سے کم نہیں۔ اگر اس میں سے پچاس ہزار اشعار اور کم کر دیئے جائیں تب بھی دو لاکھ شعر کی تعداد کا یقینی نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو شاہنامہ فردوسی کے سہ چند سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ میر انیس مرحوم کے ہزاروں مرثیوں اور سلاموں اور رباعیوں میں سے پانچ جلدیں مطبع منشی نولکشور صاحب لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں۔ اُن میں وہ مشہور مرثیے اور سلام اور رباعیاں طبع ہوئی ہیں جو عام

طور پر شائع ہو چکے تھے۔ باقی کئی ہزار مرثیے اور سلام اور رباعیاں اُن کے گھر میں محفوظ تھے جو میر انیس کے بعد اُن کے خاندان میں تقسیم ہو گئے اور اب وہ بطور تبرک جا بجا یادگار ہیں لیکن وہ حضرات اُن کا چھپوانا پسند نہیں کرتے۔ ایک صاحب نے میر انیس کی رباعیات مشتہرہ کو جمع کر کے منشی رحمت اللہ صاحب رعد کانپوری کے نامی پریس میں نہایت اعلیٰ درجہ کے اہتمام سے چھپوایا ہے اس پاکٹ بک کی قیمت تین روپے ہے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ابھی میر انیس کی تصنیف کا تمام سرمایہ اُن کے خاندان میں باقی ہے۔ اگر میر صاحب کے باقیات الصالحات میں سے کوئی صاحب اُس کو ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیں تو وہ بجائے خود قایم رہ سکتا ہے۔ ورنہ زمانے کے ہاتھوں خدا جانے کیا صورت پیش آئے۔

میرا مشاہدہ اور واقفیت

اس کتاب کے متعلق چند باتیں اپنے مشاہدہ اور واقفیت سے لکھتا ہوں۔

(۱) میں نے جناب میر زاد بیر اعلے اللہ مقامہٗ کو لکھنؤ میں دیکھا ہے مگر اُن کو پڑھتے نہیں سُنا ہے۔

(۲) میں نے جناب میر انیس نور اللہ مرقدہٗ کو لکھنؤ میں مرثیہ پڑھتے دیکھا ہے۔ اُن کے اعجاز فصاحت کے اظہار سے میری زبان قاصر ہے۔ آنکھوں نے جو دیکھا اُسکے زبان نہیں جو وہ کچھ کہہ سکے۔ اور زبان جو کچھ کہہ سکتی ہے وہ اُس کی اَن دیکھی بات ہے۔

(۳) میر مونس مرحوم کو دیکھا ہے سُنا نہیں۔

(۴) میر انس مرحوم کو حیدر آباد میں دیکھا اور نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی مجلس میں اُنکی مرثیہ خوانی سے شرف اندوز ہوا ہوں۔

(۵) مہر نفیس مرحوم کو وہیں حیدر آباد میں نواب تہور جنگ بہادر کے یہاں اور میر سلیس مرحوم کو نواب بہرام جنگ بہادر کے یہاں زیب ممبر دیکھا ہے۔

(۶) میر وحید کو نہیں دیکھا اور نہ اُن کا مرثیہ پڑھنا سُنا۔

(۷) وقت ترتیب کتاب ہذا ۱۳۲۵ھ ہجری میں میر انیس مرحوم کے پوتے دولھا صاحب اور میر صاحب مرحوم کے نواسے میر محمد علی صاحب عارف اور پیارے صاحب رشید یادگار خاندان ہیں۔ میں نے نہیں سُنا مگر سنتا ہوں کہ بہت اچھا کہتے اور پڑھتے ہیں۔ ان میں جناب رشید نواب تہور جنگ بہادر کے یہاں حیدر آباد تشریف لیجاتے ہیں۔ ایک مجلس میں اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر فرمانروائے حیدر آباد بھی تشریف لائے تھے اور جناب رشید کو سُن کر بہت خوش ہوئے۔

(۸) میرزا دبیر مرحوم کے جانشین اُن کے خلف الصدق میرزا اوج سلمہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں یہ صاحب اربعین میں حیدر آباد تشریف لیجاتے ہیں اور نواب فیاض علیخاں صاحب کے آراستہ و پیراستہ عاشور خانہ میں پڑھتے ہیں۔ ایک مجلس میں اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد بہ نفس نفیس اچانک تشریف لے جاکر شریک ہوئے اور میرزا اوج کا پڑھنا سُن کر بڑی دلچسپی ظاہر فرمائی۔ اور ختم مجلس تک عام طور سے ممبر کے سامنے ادب سے دوزانو بیٹھے رہے۔ جس سے حضور نظام کے حُسن عقیدت کا پتہ ملتا ہے۔ خدا دیر تک سلامت رکھے۔

میر انیس کا مزار

مرم کے مسافر نے بسایا ہے تجھے　　رُخ سب سے پھرا کے مُنہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ لپٹ کے سوؤں اے قبر　　میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

لکھنؤ میں جب اعلیٰ درجے لوگ مرتے ہیں تو ان کی قبر کے لئے تال کٹورے کی کربلا یا اور کسی کربلا اور متبرک مقام میں سیکڑوں روپیہ دیکر زمین لی جاتی ہے۔ خاص لوگوں کے لئے آبادی کے اندر خاص شروط سے متوفی کے دفن کی اجازت ہو جاتی ہے یہ اجازت میونسپلٹی سے حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اسی خصوصیت سے جناب میر انیس اعلے اللہ مقامہٗ اپنے مکان واقع سبزی منڈی متصل چوک لکھنؤ کے قریب اپنے ہی ایک مکان میں دفن ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا دالان ہے۔ مجکو میر انیس کی مستغنی عن البیان شہرت۔ اور اُن کی ایسی مقبول عام خدمت اور اُن کے قدر شناس امرا اور لکھنؤ کے فیاض اور اپنے شہر کی خود داری کا خیال رکھنے والے ارباب ہمت سے تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ان بزرگوں نے اپنے اتنے بڑے شہرۂ آفاق شخص کے لئے کوئی خاص یادگار کا انتظام نہیں کیا۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ آج کل کے قومی طرز عمل سے واقف نہیں۔ اُن کو معلوم نہیں کہ یہ زمانہ ایک ایسے شخص کے مرنیکے بعد اُسکو کن تدبیروں سے زندہ رکھنا چاہتا ہے اور وہ ملک اور قوم کی عام توجہ کا کس قدر مستحق ہو سکتا ہے۔

شمس العلماء مولانا آزاد کی رائے و تحقیق

میر ببر علی انیس نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں اپنے باپ کے شاگرد تھے اور جس طرح عمر میں دونوں بھائیوں سے بڑے تھے اسی طرح کمال میں بھی فایق تھے۔ ابتدا میں انہیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل پڑھی وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ سن کر دل میں تو باغ باغ ہوا مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ انہوں نے حال بیان کیا۔ غزل سنی اور فرمایا کہ بھائی اب اس غزل کو سلام کرو۔ اور اس شغل میں زور طبع کو صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اسی دن سے اُدھر سے قطع نظر کی۔ غزل مذکور کی طرح میں سلام لکھا دنیا کو چھوڑ کر دین کے دائرے میں آ گئے۔ اور تمام عمر اسی میں صرف کر دی نیک نیتی کی برکت نے اسی دنیا میں بھی دیا اور دنیا بھی۔ اُس وقت تک یہ اور ان کے ہمعصر اپنے اُستادوں کی اطاعت کو طاعت سمجھتے تھے۔ سلام۔ مرثیے، نوحے، رباعیاں لکھتے تھے، اور مرثیے کی مقدار ۳۵-۴۰ سے ۵۰ بند تک تھی۔ زمانے کی خاصیت طبعی ہے کہ جب نباتات پرانے ہو جاتے ہیں تو انہیں نکال کر پھینک دیتا ہے نئے بودے لگاتا ہے

میر ضمیر اور میر خلیق کو باپ کے پلنگ پر بٹھایا۔ میر انیس کو باپ کی جگہ مسند پر ترقی دی۔ اُدھر سے مرزا دبیر ان سے مقابلہ کے لئے نکلے۔ یہ خاندانی شاعر نہ تھے مگر ضمیر کے شاگرد رشید تھے۔ جب دونوں جوان میدانِ مجالس میں جولانیاں کرنے لگے تو فنِ مذکور کی ترقی کے بادل گرجتے اور برستے اُٹھے اور نئے اختراع اور ایجادوں

کے مینہ برسنے لگے۔ بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر امرا اور غربا تک شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ نوجوانوں کے کمال کو خوش اعتقاد قدردان ملے وہ بزرگوں سے شمار میں زیادہ اور وزن میں بہت بھاری تھے۔ کلام نے وہ قدر پیدا کی کہ اس سے زیادہ ہشت ہی میں ہو تو ہو!

قدردانی بھی نقط زبانی تعریف اور تعظیم و تکریم میں ختم نہ ہو جاتی تھی۔ بلکہ نقد و جنس کے گراں بہا انعام تحائف اور نذرانوں کے رنگ میں پیش ہوتے تھے؛ ان ترغیبوں کی بدولت فکروں کی پرواز اور ذہنوں کی رسائی امید سے زیادہ بڑھ گئی!

دونوں باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں! اور ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون اور ہر قسم کے خیال۔ ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں رُلا دیں۔ چاہیں ہنسا دیں، چاہیں تو حیرت کی مورت بنا کر بٹھا دیں۔

یہ دعوے بالکل درست تھے، کیونکہ مشاہدہ اُن کی تصدیق کو ہر وقت حاضر رہتا تھا دلیل کی حاجت نہ تھی۔ سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اُس میں چند میدانِ جنگ ہیں؛ رزم زنگبار جنگ دارا۔ جنگ روس، جنگ فور، جنگ فغفور اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن ہیں، شاہنامہ میں ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی کے ہیں۔ اُنہوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیئے، ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیے کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقابلہ نیا اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ، رات کی رخصت، سیاہی کا چھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شام غریباں کی اُداسی، کبھی رات کا سناٹا کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ دکھایا ہے؛ غرض

جس حالت کو لیا ہے اُس کا سماں باندھ دیا ہے، آمد مضامین کی بھی انتہا نہ رہی۔ جن مرثیوں کے بند چالیس پچاس سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ (۱۵۰) سے گذر کر ۲۰۰ سے بھی نکل گئے۔ میر انیس مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔ اور سلاموں کا تو کیا شمار ہے۔ رباعیاں تو انکی باتیں تھیں۔

دونوں اُستادوں کے ساتھ طرف داروں کے دو جتھے ہو گئے۔ ایک انیسیئے کہلاتے تھے دوسرے دبیریئے۔ اگرچہ ان کے فضول فخریوں اور اعتراضوں نے بیجا تکراریں اور جھگڑے پیدا کئے مگر بہ نسبت نقصان کے فائدہ زیادہ ہوا۔ کیونکہ بیحد تعریفوں نے دونوں اُستادوں کی فکروں کو شوق ایجاد اور مشق پرواز میں عرشِ الٰہی سے بھی اونچا اُچھال دیا؟

دونوں اُمتیں جو اپنے دعووں پر دلیلیں پیش کرتی تھیں کوئی وزن میں زیادہ ہوتی تھی کوئی مساحت میں، اس لئے یک طرفی فیصلہ نہ ہوتا تھا۔

انیسی اُمت اپنے سخن آفریں کی صفائی کلام، حُسنِ بیان اور لطافتِ محاورہ پیش کر کے نظیر کی طلبگار ہوتی تھی۔

دبیری امت شوکتِ الفاظ بلند پروازی اور تازگی مضامین کو مقابلہ میں حاضر کرتی تھی۔

انیسی اُمت کہتی تھی کہ جسے تم فخر کا سرمایہ سمجھتے ہو یہ باتیں دربارِ فصاحت میں نامقبول ہو کر خارج ہو چکی ہیں؟ کہ فقط کوہ کندن و کاہ برآوردن ہے۔

دبیری امت کہتی تھی کہ تم اسے دشواری کہتے ہو، یہ علم کے جوہر ہیں۔ اسی بلاغت کہتے ہیں۔ تمہارے سخن آفریں کے بازوؤں میں علم کی طاقت ہو تو پہاڑوں کو چیرے اور یہ جواہر نکالے؟ انیس کے کلام میں ہے کیا؟ فقط زبانی باتوں کا جمع خرچ ہے۔

انیسی اُمت اس جواب پر چمک اٹھتی تھی اور کہتی تھی، کونسا خیال تمہارے سخن آفریں کا ہے جو ہمارے معنی آفریں کے ہاں نہیں ہے؟ تم نہیں جانتے؟ جسے باتوں کا جمع خرچ کہتے ہو یہ صفائی کلام اور قدرتِ بیان کی خوبی ہے!!! اسے سہل ممتنع کہتے ہیں؟ یہ ایک جوہر خداداد ہے۔ کتابیں پڑھنے اور کاغذ سیاہ کرنے سے نہیں آتا۔

دبیر یئے اس تقریر کو سُنکر کسی مرثیے کی تمہید یا میدان کی آمد یا رجز خوانی کے بند پڑھنے شروع دیتے۔ جن میں اکثر آیتوں یا حدیثوں کے فقرے تضمین ہوتے تھے۔

انیسیئے کہتے تھے، اس سے کس کا فر کو انکار ہے، مگر اتنا ہی پڑھیئے گا۔ آگے نہ پڑھیئے گا۔ ورنہ ربط بھی نصیب نہ ہوگا۔ حضرت فقط لفاظی کی دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا اداے مطلب اصل شے ہے، اس پر گفتگو کیجئے گا تو پوری بات بھی نہ ہو سکے گی، یہ قادر الکلام باکمالوں کا کام ہے، جن کو اس فن کے اصول بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچے ہیں وہی اس کام کو جانتے ہیں۔

دبیر یئے اس کے جواب میں اپنے سخن آفریں کی آمد طبیعت، مضامین کا وفور، نقطوں کی بہتات دکھاتے تھے۔ اور جا و بیجا کہتے جاتے تھے کہ دیکھئے کیا محاورہ ہے دیکھئے کیا صاف بول چال ہے۔ کس کا منہ ہے جو رات کو بیٹھے اور سو بند کہکر اُٹھے۔ برس دن تک خامہ فرسائی کی اور محرم پر دس پندرہ مرثیے لکھ کر تیار کئے وہ بھی اور دو بھائیوں کے مشورے ملا کر۔ اور مباحثوں کے پسینے بہا کر۔

انیسیئے کہتے تھے درست ہے جو رات بھر میں سو بند کہتے ہیں وہ بے ربط اور بے اصول ہی ہوتے ہیں اور جب ادائے مطلب پر آتے ہیں تو اتنے بھی نہیں رہتے۔ ساتھ ہی اس کے بعض مصرعے پڑھ دیتے تھے جن پر بے محاورہ ہونے کا اعتراض ہوتا تھا یا تشبیہیں ناقص ہوتی تھیں، یا استعارے بگڑے ہوتے تھے۔

اعتراضوں کی رد و بدل یہانتک ہوتی تھی کہ دبیر یہ کہتے تھے کہ جو قبولیت خدا نے ہمارے سخن آفریں کو عطا کی ہے کب کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ جس مجلس میں انکا کلام پڑھا گیا کہرام ہوگیا۔

انیسیے کہتے تھے وہ کیا پڑھیں گے، انکی آواز تو دیکھیئے، انہیں مرثیہ پڑھنا تو آتا ہی نہیں۔

غرض جھگڑا لوگ دعویداروں کو کوئی تقریر خاموش نکر سکتی تھی، تب منصفی بیچ میں آکر کہتی تھی، دونوں اچھے، دونوں اچھے۔ کبھی کہتی وہ آفتاب ہیں یہ ماہتاب۔ کبھی کہتی یہ آفتاب ہیں وہ ماہتاب۔

لکھنؤ کے بیفکرے لڑانے میں کمال رکھتے تھے۔ اور تماشے کے عاشق۔ دبیر تو غیر تھے۔ بھائی کو بھائی (انیس و مونس) سے لڑوادیا۔ میر انیس کے پاس آتے تو کہتے کہ جب تک حضور کے اصطلاحی مرثیے ہیں پڑھے جائیں، جس دن آپ کا بن دیکھا مرثیہ پڑھا قلعی کھل جائے گی، دوسرے بھائی سے۔ کہتے عمر کی بزرگی اور شے ہے، یہ نعمت آپ کا حصہ ہے۔

الغرض یہ پاک روحیں جن کی بدولت ہماری نظم کو قوت اور زبان کو وسعت حاصل ہوئی صلہ انکا سخن آفریں عطا کرے۔ ہمارے شکریہ کی کیا بساط ہے۔

تباہی لکھنؤ کے بعد ان دونوں استادوں کو باہر جانے کی ضرورت پیش آئی ۱۸۵۸ء میں میرزا دبیر عظیم آباد بلائے گئے وہ گئے۔ پھر ہمیشہ الہ آباد اور بنارس جاتے رہے اسی طرح میر انیس مرحوم اول ۱۸۵۹ء میں نواب قاسم علی خاں کے طلب اور اصرار سے عظیم آباد کو تشریف لے گئے۔ پھر وہاں جانے کا دستور ہوگیا۔ ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ بہادر نے حیدر آباد میں طلب فرمایا۔ اہل حیدر آباد نے ان کے کمال کی ایسی قدر کی جیسی چاہیئے۔ مجلسوں میں لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ عالی شان مکان کی

وسعت بھی جگہ نہ دے سکتی تھی۔

میر انیس کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں مستند تھی۔ اور انہیں بھی اس بات کا خیال تھا حسنِ اخلاق گفتگو میں انکی تقریر کو اتنا بچائے ہوئے لیچلیتا تھا کہ باتیں حدِّ اعتدال سے بھی نیچے ہی نیچے رہتی تھیں۔ اس پر ایک ایک لفظ کانٹے کی تول کسی جگہ اپنا کلام سناتے تو بعض محاورہ پر اتنا کہہ اٹھتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے، حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔

جس طرح ان کا کلام لاجواب دیکھتے ہو۔ اسی طرح ان کا پڑھنا بھی بے مثال تھا۔ ان کی آواز۔ ان کا قد و قامت انکی صورت کا انداز غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک موزوں واقع ہوئی تھی۔ انکا اور اُنکے بھائیوں کا یہی قاعدہ تھا کہ ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر خلوت میں بیٹھتے تھے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ وضع حرکات۔ سکنات اور بات بات کو دیکھتے تھے اور آپ اُس کی موزونی پر خیال کرتے تھے۔

سنہ ۱۲۹۱ ہجری میں رحلت فرمائی۔ کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

میر انیس کے حریف مقابل

میرزا دبیر

میرزا سلامت علی دبیر خاندانی شاعر نہ تھے۔ میرزا غلام حسین عرف میرزا آغا جان کے لڑکے تھے۔ میرزا دبیر نے لڑکپن میں مرثیہ گوئی کا شوق کیا۔ اس شوق نے ممبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ اُستاد سے پایا اُسے بہت بلند اور روشن کر دکھایا

تمام عمر مرثیہ گوئی سے سروکار رہا۔ اور اس فن کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہوگیا۔ ان کی سلامت روی۔ پرہیزگاری۔ مسافر نوازی سخاوت اور فروتنی نے صفت کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔

لکھنؤ میں لڑنیوالے غضب کے تھے۔ مرزا صاحب کا عالم شباب تھا۔ اور کمال بھی عین شباب پر تھا کہ جوانی کا بڑھاپے سے معرکہ ہوا۔ نواب شرف الدولہ میر ضمیر کے بڑے قدردان تھے۔ اُن سے ہزاروں روپے کے سلوک کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں اول مرزا بعد اُن کے میر ضمیر پڑھا کرتے تھے۔ لیکن ایک مجلس میں بے لطفی ہوگئی آخر کار میر ضمیر نے میرزا دبیر کے شہرۂ کمال کو دیکھ کر اُن کے نکتہ مقابل بننے سے پرہیز کیا۔ اور ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہوگیا۔ زمانے نے اپنے قاعدے کے بموجب چند روز مقابلوں سے شاگردوں کا دل بڑھایا اور آخر کار بڑھاپے کی سفارش سے اُستاد کو آرام کی اجازت دی۔ وہ اپنے حریف میر خلیق کے سامنے گوشۂ عزلت کا مقابلہ کرنے لگے۔ اور یہاں "میر انیس اور میرزا دبیر" کے معرکے گرم ہوگئے۔

دونوں کے کمال نے سخن شناسوں کے ہجوم کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ آدھے انیسیے ہوگئے آدھے دبیریے۔ ان کے کلام میں محاکمہ کرنے کا لطف جب ہے کہ ہر اُستاد کے چار چار پانچ پانچ سو مرثیے بجائے خود پڑھو۔ اور پھر مجلسوں میں سُن کر دیکھو کہ ہر ایک کا کلام اہل مجلس پر کس قدر کامیاب ہوا یا ناکام رہا۔ بے اسکے مرزا نہیں۔ میر انیس صفائی کلام لطف زبان چاشنی محاورہ۔ خوبی بندش حسن اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے۔ مگر میرزا دبیر بھی شوکت الفاظ مضامین کی آمد اس میں جا بجا غم انگیز اشارے درد خیز کنائے دل گداز انداز کے جو مرثیے کی اصلی غرض ہے بادشاہ تھے۔ یہ اعتراض حریفوں کا درست ہے کہ بعض ضعیف روایتیں نظم کر گئے لیکن انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب ایک مقصود کو مدنظر رکھ کر اُس پر متوجہ ہوتا ہے

تو اور پہلوؤں کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ انہیں ایسی مجلسوں میں پڑھنا ہوتا تھا جہاں ہزاروں آدمی دوست دشمن جمع ہوتے تھے۔ تعریف کی بنیاد گریہ و بکا اور لطف سخن اور ایجاد مضامین پر ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رلانا اور سب کے منہ سے تحسین کا نکالنا اس شوق کے جذبہ اور فکر ایجاد کی محویت میں جو کچھ قلم سے نکل جائے تعجب نہیں نکتہ چینی ایک چھوٹی سی بات ہے جہاں چاہا دو حرف لکھ دیئے۔ جب انسان تمام عمر اس میں کھپا دے تب معلوم ہوتا ہے کہ کتنا کہا اور کیسا کہا۔ میرزا صاحب نے ۲۹ محرم ۱۲۹۴ھ کو بہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس مدت میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ انکے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا نہ اب ویسا زمانہ آئے گا نہ ایسے صاحب کمال پیدا ہوں گے۔

شمس العلماء مولانا حالی کی رائے

زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف کو مرثیہ کہتے ہیں عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیے ایسے سچے اور صحیح حالات و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُن سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی۔

ہمارے شعرا نے مرثیہ میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے۔ مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہدا کے مرثیے پر ہوتا ہے۔ یہاں مرثیے کی ابتدا اول اُسی اصول پر ہوئی تھی۔ یعنی میت کو یاد کر کے حزن و ملال کا اظہار کرنا۔ چنانچہ جو مرثیے اول اول لکھے گئے وہ کم و بیش بیس تیس بیت سے زیادہ نہ ہوتے تھے اور اُن میں مرثیت یا بین کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا

مگر چونکہ مرثیہ ایک خاص مضمون کے دائرہ میں محدود تھا اور اُس کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ لہذا متاخرین کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدت پیدا کریں اور اس کے مضامین میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اُردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہیے تھی اُس میں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح، فخر و مباہات، رزم اور بزم بھی نہایت شد و مد کے ساتھ شامل ہو گئی جس نے اُردو شاعری میں بہت وسعت پیدا کر دی

پہلے جہانتک ہم کو معلوم ہے میر ضمیر[۵۱] نے ایسے مرثیے لکھے ہیں گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں مگر میر انیس نے کہ باوجود خداداد مناسبت کے چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُن کے خاندان میں چلی آتی تھی۔ اس پر اُردو زبان کے مالک تھے۔ اور لکھنؤ بنا ہوا تھا۔ اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا اور اُردو شاعری میں جو کہ ماوراکد کی طرح مدت سے بحبس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا۔ اُنھوں نے بیان کر نیکے نئے نئے اسلوب اُردو شاعری میں کثرت سے پیدا کر دیئے۔ ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا اور زبان کا ایک معتدبہ حصہ جس کو ہمارے شاعروں کی قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا اُس کو شعرا سے روشناس کرا دیا۔ آج کل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اُس نے اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کئے ہیں اگر ہم اسی کو معیار کمال قرار دیں تو بھی "میر انیس" کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا اس خاص طرز کے مرثیوں کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اُردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انہیں لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے

[۵۱] میر ضمیر اُستاد میرزا دبیر ۱۲

بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیوں میں بیان کئے ہیں اُن کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔ امام حسین کے تمام حالات شجاعت سخاوت عفت۔ عدالت کا سب سے زیادہ روشن اور مکمل نمونہ ہیں جو حسن اخلاق کا موضوع حقیقی ہے۔ باقی تمام اخلاق انہیں چار اصول کے فروع ہیں جو سب کے سب ان چار کے تحت میں دیکھے اور دکھلائے جا سکتے ہیں۔

جناب شمس العلماء مولوی امداد امام صاحب اثر

رئیس عظیم آباد کی رائے

اُردو کی موجودہ شاعری فارسی کی شاعری کے ساتھ بہت مشابہت رکھتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اُردو کے شعرا فارسی کے شعرا کی ہمیشہ تبعیت کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ تقاضائے ملک یہ تھا کہ اُردو کی شاعری سنسکرت کی شاعری کا انداز پیدا کرتی۔ ایسی صورت میں اُردو کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا۔ مگر اس عدم تتبع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اُردو کے شعرا زبان سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور چونکہ عموماً صرف فارسی میں مہارت رکھتے تھے اسی لئے اُسی زبان کی تبعیت کی۔ کاش شعرائے اُردو سنسکرت کی شاعری سے مطلع ہو کر اُس کا چربا اُتارتے تو اصناف شاعری میں اُردو کا درجہ بڑھ جاتا۔ مثلاً ڈراما نگاری جو فارسی میں نہیں اُردو میں داخل ہو جاتی۔ اور ڈراما نگاری کے داخل ہو جانے سے اُردو کی شاعری بلاشبہ ممتاز تر ہو جاتی۔ فارسی کی طرح عربی میں بھی رامائن جیسی مبسوط کتابیں

نہیں اس لئے عربی کو بھی اس بحث سے خارج سمجھنا چاہیئے۔

بہرحال اردو کی موجودہ شاعری کی حالت یہ ہے کہ اگر میر انیس کو شعرائے اُردو کے زمرہ سے نکال لیجئے تو اردو کی شاعری فارسی کی شاعری سے بہت پیچھے رہجاتی ہے یہ جناب غفراں مآب کا کمال ہے کہ جس کے باعث اردو کی شاعری نہ صرف فارسی کی شاعری سے اعلیٰ دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ یونانی، لاطینی اور انگریزی شاعریوں سے ارفع پائی جاتی ہے۔ لاریب حضرت کی مرثیہ نگاری نے رزمی شاعری کا وہ عالم دکھایا ہے کہ جس کے مشاہدے سے عقل دنگ ہوجاتی ہے۔ گو حضرت نے کوئی کتاب، رامائن، مہابھارت ایلیڈ، انیڈ، شاہنامہ، یا پیڈایز لاسٹ کے طور کی منظوم نہیں فرمائی تو بھی رزمیہ شاعری کا جواب فردوسی والمیکی اور بیاس کی تصنیفوں کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔

امداد امام

شمس العلماء علامہ شبلی کی رائے کا اقتباس

از کتاب موازنۂ انیس و دبیر

عرب میں سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی۔ اسکے بعد شاعری اصلی حالت سے نکل کر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ خود بخود زوال پذیر ہوگیا کیونکہ قصائد کی طرح اس سے کچھ صلہ نہیں مل سکتا تھا۔ اسی زمانہ میں کربلا کا واقعہ پیش کیا اس وقت میں اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی مگر زمانہ نے بنو امیہ اور بن العباس کی سلطنت میں اس رنگ کو ابھرنے نہ دیا۔

فارسی شاعری کی بنیاد تکلف آور داد اور مداحی پر قائم ہوئی تھی اس لئے شاعری کے وہ جذبات جن کو شاعری سے خاص تعلق تھا پستی کی حالت میں آگئے۔ فردوسی نے سہراب کا مرثیہ جو اُس کی ماں کی زبان سے لکھا تھا اُسکے اشعار سے اسکا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

بمادر خبر شد کہ سہراب گرد — ز تیغ پدر خستہ گشت و بمرد
خروشید و جوشید و جامہ درید — بزاری برآں کودکِ نارسید
بزد چنگ و بدرید پیراہنش — درخشاں شد آں لعل زیبا تنش

اسی زمانہ کے قریب سلطان محمود کی وفات پر فرخی نے مرثیہ لکھا جو گیارہ شعر کا ہے اس کے بعد مرثئے بہت کم لکھے گئے۔ البتہ شیخ سعدی اور امیر خسرو کے دو مرثئے مشہور ہیں لیکن چونکہ اس زمانہ میں عیش و طرب کی مجلسیں غزل کے ترانوں سے گونج رہی تھیں اس لئے اس کا اثر عام نہ ہوا۔ جب صفویہ اور تیموریہ کا زمانہ آیا تو اس دور میں محتشم کاشی نے آٹھ دس بند کا ایک مرثیہ لکھا جس کا جواب آجتک نہ ہو سکا لیکن تمام ملک میں قصیدہ اور مدح کا رنگ اس قدر چھایا ہوا تھا کہ عام شعرا پر اس کا چنداں اثر نہیں ہوا۔ طالب آملی۔ غزالی مشہدی۔ سلیم۔ کلیم وغیرہ شعرائے متاخرین کے کلام میں اور سب اصناف سخن پائے جاتے ہیں لیکن مرثیہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے قدسی نے اپنے جوان بیٹے کا مرثیہ لکھا لیکن نوبادہ رسالت کے غم میں دو شعر بھی نہ لکھے ظہوری نے مرثئے لکھے لیکن وہ اپنا جوش نہ تھا بلکہ عادل شاہ کے مذاق کی خوشامد تھی۔ پھر محتشم کی طرح "مقبل" نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی۔ مقبل کے بعد ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا۔ اور مرثئے کے اور بہت سے اقسام پیدا ہو گئے مثلاً نوحہ پیش خوانی وغیرہ۔

ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولی سے ہوئی لیکن اُنکے کلام میں مرثیہ کا پتا نہیں چلتا ہاں سودا و میر سے پہلے مرثئے کے رواج کا پتہ ملتا ہے میر تقی نے بھی برائے نام مرثیہ لکھا ہے۔ اس وقت تک مرثئے عموماً چو مصرعے ہوا کرتے تھے۔ سودا نے مسدس

لکھا۔ میر ضاحک اور میر حسن نے بھی مرثیے لکھے ہیں جواب نہیں ملتے۔

سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر میرزا دبیر کے اُستاد ہیں۔ اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے اب تحت اللفظ کا بھی رواج ہوا۔ غالباً پہلا شخص جس نے ممبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھا وہ میر ضمیر تھے۔ نئی تشبیہیں نئے استعارے پسندیدہ مبالغہ واقعہ نگاری مناظر قدرت کی تصویر وغیرہ تمام محاسن کلام میر ضمیر کے ہاں پائے جاتے ہیں مگر اُن کے ہاں ان کا رنگ ہلکا سا تھا میر انیس اور میرزا دبیر نے اُس کو زیادہ شوخ کر دیا۔

مرزا دبیر میر ضمیر کے شاگرد تھے اور میر انیس نے اپنے باپ میر خلیق سے مشق فن کی ہے۔ میر انیس نے شاعری میراث میں پائی تھی اور مرثیہ گوئی خاندانی ورثہ تھا جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس اور اُن کے حریف مقابل میرزا دبیر کے کلام سے یہ پتہ نہیں ملتا کہ کون مرثیہ یا سلام کس نے پہلے لکھا ہے اس سے متعین نہیں ہوتا کہ فلاں باب میں ایجاد کا فخر کس کو ہے۔

میر انیس کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہوا ہے لیکن میر صاحب کے متوسلین کا خاص دعویٰ ہے کہ ان مرثیوں میں بہت کچھ تحریف اور غلط ہے۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے ایک رسالہ میرزا دبیر اور میر مونس کے اغلاط کے متعلق لکھا تھا اُس کا جواب میرزا محمد رضا متخلص بہ عجز شاگرد ناسخ نے لکھا جس کا نام تطہیر الادساخ ہے اور ۱۲۹۶ھ میں مطبع شعلہ کانپور میں چھپا تھا۔

میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی انکی ابتدائے مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ کثرت سے متداول تھے اور شعراء بے تکلف استعمال کرتے تھے اس قسم کے

الفاظ میر انیس کے ہاں بھی ابتدا کلام میں پائے جاتے ہیں پھر جس قدر زمانہ گذرتا گیا میر صاحب اُن الفاظ اور تراکیب کو چھوڑتے گئے۔

میر انیس نے ہر مقام پر جزئیات بلاغت کا خیال رکھا ہے، بچے، جوان، بوڑھے، بی بی، باندی، امام، اعزا، اعوان، انصار اور فرقہ مخالف کے مبارز اور پہلوانوں کے متعلق ہر درجہ اور ہر شخص کے مناسب حال داد کمال دی ہے۔ اور مکمل طور سے جزئیات بلاغت کی توضیح کی ہے۔ پھر تشبیہات اور استعارات کی خوبیاں بجائے خود قابل دید ہیں۔ جذبات فطرت اور مناظر قدرت کی مثیل تصویریں کھینچی ہیں واقعہ نگاری کی ترتیب اور سلسلہ بندی میں وہ قابل قدر کمال صرف کیا ہے جو اردو میں میر انیس کا حصہ ہے روزمرہ کی صفائی تو میر انیس کے گھر کی چیز ہے اُس سے بہتر اور کہیں نہیں ملتی۔ میر صاحب کا کلام ابتذال سے پاک ہے۔ میر انیس نے بعض غلط واقعات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے جس سے سب کو واقعیت کا دھوکا ہوا اور اب وہ بطور ایک واقعۂ مسلمہ کے تمام مرثیہ گویوں کے ہاں مانے جانے لگے۔

رزمیہ شاعری میں عربی شاعری شاہنامہ فردوسی کی نظیر نہیں پیش کر سکتی یہ تو بڑی بات ہے عربی میں کوئی مسلسل رزمیہ نظم پچاس شعروں کی بھی نہیں مل سکتی۔ فردوسی کا یہ بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات، داؤں پیچ، فنون جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا لڑائی کے ہر قسم کے کرتب نہیں دکھاتا لیکن میر انیس لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

میرزا دبیر اُنکے حریف مقابل مانے جاتے ہیں لیکن میر انیس کی فصاحت میرزا دبیر کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔ بندش میں تعقید اور اغلاق، اور تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار نظر آتے ہیں بلاغت نام کو نہیں کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سی

وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اُس کو سنبھال نہیں سکتے اس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ اُنکے کلام میں یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں۔ وہ نہایت پُرگو تھے اُنکے اشعار کا شمار لاکھوں تک ہے اور اخیر اخیر میں وہ میر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے۔ اس بنا پر اُنکے کلام میں جا بجا شاعری کے لوازم پائے جاتے ہیں لیکن میر انیس کے مقابلہ میں وہ بہت کم ہیں[1]۔ اسی طرح میر انیس کے محاسن شاعری کے متعلق فرماتے ہیں۔

مجاز، تشبیہ، استعارہ، تمثیل

یہ چیزیں حسن کلام کا زیور ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم و نثر اور تقریر و تحریر میں جو کچھ جادو گری ہے وہ انہیں کی بدولت ہے۔ ایک جاہل سے جاہل شخص بھی جب اپنے کلام میں تاثیر پیدا کرنا چاہتا ہے یا کسی خاص جوش کی حالت میں اسکی زبان سے بے اختیار اثر پیدا کرنے والے الفاظ نکلتے ہیں تو اسلوب کلام میں خود بخود مجاز، تشبیہ استعارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک عامی بھی جب غصہ میں آتا ہے تو حریف سے کہتا ہے کہ "میں تجکو مسل ڈالونگا تیرے پرخچے اڑا دونگا" غم کی حالت میں کہتا ہے "چھاتی پھٹ گئی، دل میں داغ پڑ گئے کلیجہ چھد گیا، یہ تمام استعارات ہیں جو بے اختیار زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اور جن سے کلام کی تاثیر دوچند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے۔

[1] میر انیس اور میرزا دبیر کے مقابلہ کی بحث ان چند سطروں پر تمام نہیں ہو سکتی اُس کے لئے دونوں صاحبوں کے مجامیع تصنیفات پر نظر کرنا اور بات بات کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھنا اور دکھلانا ہوگا جس کے لئے مہینوں کی فرصت درکار ہے۔ اس لئے میں اس مقام پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(اشہری)

اسی بنا پر شعر کی حسن و خوبی کا بڑا معیار یہ ہے کہ اس میں موقع بموقع تشبیہات و استعارات پائے جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح ہر چیز جب تک نیچرل حالت میں رہتی ہے اُس کا اصلی حُسن قایم رہتا ہے، جب تکلف اور تصنع شروع ہوتا ہے تو اثر میں کمی آجاتی ہے اسی طرح تشبیہ اور استعارہ میں بھی جب بہ قصد و تکلف، غرابت اور غیر معتدل ضرورت پیدا کی جاتی ہے تو اصلی اثر جاتا رہتا ہے۔

اردو کی شاعری میں جس طرح اور بہت سے بے معنی تکلفات پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے شاعری کا اصلی جوہر خاک میں ملا دیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی بھی حالت بدل گئی ہے اور طرہ یہ کہ آج کل کے اہل سخن بدمذاقی سے اسی کو کمال سخن سمجھتے ہیں۔ اس پر پہلے ہم کو مختصر طور پر ان چیزوں کی حقیقت بتانی چاہیئے اور یہ دکھلانا چاہیئے کہ تشبیہ اور استعارہ سے کلام میں کیوں حسن پیدا ہوتا ہے۔

مجاز، تشبیہ، استعارہ۔ درحقیقت ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں۔ "زید شیر ہے" مجازی، "زید شیر کے مشابہ ہے" تشبیہ ہے، "شیر آرہا ہے" جب مراد یہ ہو کہ زید آرہا ہے استعارہ ہے۔

ان سب چیزوں میں قدر مشترک اور ان قالبوں کی روح تشبیہ ہے، زید شیر ہے اسکے یہ معنی ہیں کہ زید شجاعت اور دلیری میں شیر کی مشابہ ہے، شیر آرہا ہے، اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ ایسا شخص آرہا ہے جو شجاعت اور دلیری میں شیر کے مثل ہے تشبیہ اور استعارہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ کی حالت میں متکلم یہ تسلیم کرتا ہے کہ زید آدمی ہے لیکن دعویٰ یہ کرتا ہے کہ وہ باوجود آدمی ہونے کے شجاعت میں شیر کے برابر ہے۔ برخلاف اس کے استعارہ میں وہ زید کو بالکل شیر فرض کر لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ زید آدمی ہے اور شیر کے برابر ہے، بلکہ کہتا ہے کہ زید آدمی ہی نہیں، تم جس کو آدمی سمجھتے ہو وہ آدمی نہیں بلکہ شیر ہے۔ اس بنا پر استعارہ وہ ہے کہ مشبہ کا نام نہ آئے صرف مشبہ کا ذکر

ہو مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ میدان جنگ میں رستم آیا تو کہا جائے کہ میدان میں شیر آیا" استعارہ میں زیادہ لطف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مشبہ بہ کے لوازم اور خصوصیات بھی اُسکے ساتھ ذکر کئے جائیں مثلاً میر انیس حضرت عباسؓ کی شان میں کہتے ہیں۔ ع

نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

ڈکارنا ضیغم کے خصوصیات میں سے ہے۔

استعارہ وہاں اور بھی لطیف اور نازک ہو جاتا ہے جب مشبہ بہ کا بھی ذکر نہ کیا جائے بلکہ صرف اُسکے لوازم ذکر کئے جائیں مثلاً جب کبھی بہادر شخص کے غصہ کی حالت بیان کرنی ہو تو کہا جائے کہ وہ بپھرا ہوا کھڑا ہے۔ بپھرنا شیر کے غصے کو کہتے ہیں۔ یہاں شیر کا نام نہیں لیا گیا بلکہ جو لفظ شیر کے لئے مخصوص ہے اُس سے بہادر کے غصہ کی تعبیر کی گئی ہے اس صورت میں لطف اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ متکلم گویا یہ فرض کرتا ہے کہ اس بہادر کا شیر ہونا ایک قطعی اور مسلم الثبوت امر ہے، اس لئے اس کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ شیر ہے۔ اور جب یہ مسلم ہے کہ وہ شیر ہے تو اُس کے افعال و حرکات کی تعبیر کی جاتی ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ مجاز، استعارہ، تشبیہ۔ سب کا اصلی جوہر تشبیہ ہے تو اس پر غور کرنا چاہئے کہ فطرۃً تشبیہ سے کیوں طبیعت پر اثر پڑتا ہے۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ انسان میں فطرۃً یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اشیاء کے تصور سے لطف اُٹھاتا ہے۔ ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہو گی لیکن اگر کوئی ہو بہو تصویر کھینچ دے تو ہم کو لطف آئیگا اور جس قدر اصل کے مطابق ہو گی اُسقدر طبیعت پر لطف اور استعجاب کا اثر زیادہ ہو گا۔ چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے اسلئے طبیعت کا اس سے محظوظ اور متلذذ ہونا ایک فطرتی امر ہے۔

تشبیہ کی دو قسمیں ہیں، مفرد، مرکب، مفرد جس طرح چہرہ کو پھول سے تشبیہ دی جائے

اور مرکب جس طرح کہا جائے کہ میدان جنگ میں گرد اٹھی تو اُس میں تلواریں اس طرح چمکتی تھیں جس طرح شب کو ستارے ٹوٹتے ہیں۔

مفرد تشبیہ میں چنداں جدت نہیں ہوسکتی۔ اولاً تو اس وجہ سے کہ مفرد چیزوں کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہوسکتا ہے، ثانیاً مدت سے شعراء اور اہل قلم تشبیہ سے کام لے رہے ہیں۔ اس لئے عالم قدرت میں جو چیزیں تشبیہ کے قابل تھیں اکثر کام میں آچکیں مثلاً چہرہ کو پھول، آفتاب، ماہتاب، آئینہ سے تشبیہ دے سکتے تھے سو سو دفعہ دے چکے اب عالم میں کوئی نئی چیز پیدا ہو تو تشبیہ میں بھی جدت پیدا ہو۔

البتہ مرکب تشبیہ میں ہر وقت جدت پیدا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اول تو ترکیب کی ہزاروں شکلیں ہیں دوسرے یہ کہ چند اشیاء کی ترکیب سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوتی ہے اس کے طرف ہر شخص کا خیال نہیں منتقل ہوسکتا۔

ایک نکتہ اور سمجھ لینے کے قابل ہے کہ تشبیہ کی اصلی خوبی یہی ہے کہ مشبہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور نیچرل شاعری میں جیسا کہ قدمائے عرب کی شاعری تھی تمام تشبیہیں اسی قسم کی ہوتی تھیں لیکن ایک مدت سے ایشیائی شاعری نیچرل حالت سے بہت ہٹ گئی ہے اس لئے آج اس قسم کی تشبیہات کا ڈھونڈنا بالکل بے فائدہ ہے۔ تاہم تشبیہ کی خوبیاں، میر انیس کے کلام میں جس قدر پائی جاتی ہیں اردو زبان میں انکی نظیر نہیں مل سکتی، میر انیس کی تشبیہات میں جو خصوصیات ہیں اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) اکثر تشبیہات مرکب ہیں۔

(۲) اکثر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہیں۔ اور یہی تشبیہ کا بڑا کمال ہے۔

(۳) علمائے معانی نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کسی مشبہ کی رفعت اور حُسن

اور کبھی تحقیر اور ذلت۔ اور کبھی رعب اور ہیبت ہوتی ہے۔ یہ باتیں میر انیس کی تشبیہات میں کمال درجہ پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت عباسؑ پر جب ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگی ہیں تو اس حالت کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

برچھیوں سے زخمی ہونا چونکہ شکست اور مغلوبیت کی حالت تھی۔ اسلئے اسکے بیان کرنے سے ذلت کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن اس تشبیہ نے حالت بدل دی۔ یا مثلاً جب حضرت عباس کے دونوں ہاتھ تلوار سے کٹ کر گر پڑے اور اُنہوں نے مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا تو اس طرح ادا کیا ہے ؎

مشکیزہ تھا کہ شیر کے مُنہ میں شکار تھا

یا مثلاً جب تمام اہل بیت ایک ہی رسی میں قید کئے گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

گردن میں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن

رسی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسی میں، بظاہر نہایت ذلت نما حالت تھی لیکن اس تشبیہ نے بدنمائی کو حُسن سے بدل دیا۔

یا مثلاً یہ شعر ؎

مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورعین پر — پروانے گر رہے تھے چراغِ حسینؑ پر

یا مثلاً ان اشعار میں۔

کہتی تھی یہ زرہ بدنِ بدخصال میں — پکڑا ہے پیل مست کو موہے کے جال میں

؎ گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

۵

سینے کے تھے کواڑ کہ خیبر کے بند باب　　تنورِ کرم تھا شکمِ خانماں خراب

مثلِ تنور مُنہ سے نکلنے لگا بخار

ہیبت اور بدنمائی کی تصویر کھینچ دی ہے۔

(۴) محسوسات سے جو تشبیہ دیجاتی ہے نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے کیونکہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں اس لئے اُن کے ذکر کے ساتھ فوراً انکی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اس لئے مشبہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے، اسی قسم کی تشبیہات میر انیس کے ہاں کثرت سے ہیں مثلاً بھاگڑ اور اضطراب کا بیان۔

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے

جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

تلوار کی تعریف ۵

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکے اوج سے　　پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور برچھیوں کی انیاں باہم ٹکراتی ہیں ؎

دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

اسی حالت کی ایک اور تشبیہ

شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

تعزیہ خانے میں لوگوں کا سیاہ ماتمی لباس ۵

مردم سیاہ پوش ہیں سب اور گھر سفید　　جیسے بیاضِ چشم ادھر اور اُدھر سفید

حضرت علی اکبرؓ کا چھوٹا سا نیزہ دشمن کے بھالے سے ٹکرایا ہے ؎

غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

غیض اور غضب کی حالت ؎

یوں غیض تھا عمرو کے طلب سے دلیر کو　　جس طرح ٹوک دے کوئی غصہ میں شیر کو

تلوار کے جوہر، چمک اور خم کی تشبیہ ؎

جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کی چال کا　　بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

ڈھال پر تلوار کو نہایت آسانی سے روک لینا ؎

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جھول کو　　جس طرح روک لے کوئی شہزور پھول کو

خزاں کے موسم میں پتوں کی حالت ؏

پتے برنگ چہرۂ مدقوق زرد تھے

(۵) بعض جگہ تشبیہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہے اس قسم کی تشبیہیں میر صاحب کے ہاں اعلیٰ درجے کی پائی جاتی ہیں اگرچہ فی الحقیقت ان سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہے جو اصلیت سے بہت دور کر دیتی ہے۔

گرمی کی شدت کا بیان ؎

گرداب پہ تھا شعلۂ جوالہ کا گماں　　انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں

مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں　　تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی یہ نہ جاں

پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اب ہم چند اشعار ہر قسم کی تشبیہ کے ایک جا نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ میر صاحب نے تشبیہ میں کیا کیا لطافتیں اور زاکتیں پیدا کی ہیں۔

چہرہ پر خط کی نمود ؏

دیکھو نئی بہار کہ سبزہ ہے پھول پر

؏ ہم لوگ زمانے میں حبابِ لبِ جو ہیں

ہلنے لگے درخت لرزنے لگے جبال — سبزہ نہ تھا کھڑے تھے بدن پر زمیں کے بال

چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر

گھوڑے کی تعریف

سرعت میں تھا ہرن تو وفا میں ہزبر تھا — پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا

بہار کا سامان

پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے — تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

ع- لہراتی ہے کیا نہر مثال شکم مار

ع- افلاک ہنڈولے کی طرح تھے تہ و بالا

رباعی

دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں — (دوسرا مصرعہ یاد نہیں)

یارب ترا نام پاک جپنے کے لئے — گویا اک ہڈیوں کی مالا ہوں میں

ارڈا کر گری زمیں پہ سنان اس تکان سے — گرتا ہے جیسے تیر شہاب آسمان سے

گر میان تھا تو تیغ دم امتحاں نہ تھی — یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زباں نہ تھی

یوں جلوہ گر زرہ میں تن سرخ فام تھا — گویا بچھا ہوا چمنستاں میں دام تھا

چپ ہوں مگر زبان ہے وہی اپنے کام میں — گویا کہ ذوالفقار علی ہے نیام میں

ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا — شرما کے مہ نو نے چھپایا ہے سر اپنا

ع- رہوار کیا ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

بیٹھا ہے شیر پنجہ کو ٹیکے ترائی میں — (آنکھ کی پتلی کی تشبیہ)

۵ کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں — غل تھا کہ اژدہا ہو نکالی ہوئے زباں
۵ نیزوں کی سناں کو شمشیر نے کاٹا — غل تھا کہ سرِ شمع کو گلگیر نے کاٹا

۶- ذرے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے

فقط

شبلی نعمانی

میر انیس پر اجمالی نظر

میں نے میر انیس کے ہزاروں مرثیوں میں سے دو ڈھائی سو مرثیے دیکھے ہونگے جو کثرت تصنیف کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ اسی مقدار پر سلاموں اور رباعیوں کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ انکے سوائے مولانا آزاد، مولانا حالی، مولانا امداد امام، مولانا شبلی جیسے سخن شناس و نقاد چار شمس العلماؤں کی روشنی میں اس مقام تک پہنچا ہوں کہ اپنی اجمالی رائے کا ایک مختصر خاکہ پیش کر سکوں کیونکہ تفصیلی رائے کے لئے نہ تو وہ سامان میرے پاس ہے اور نہ زمانہ اتنی فرصت کی اجازت دیتا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ جو آنکھیں قطرہ میں دریا اور ذرہ میں صحرا دیکھنے کی نگاہ رکھتی ہیں۔ وہ اس اجمال میں ایک تفصیلی صورت کو دیکھ سکیں گی۔

واضح ہو کہ میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اس میں سے ۵۶-۵۷ سال مشق فن کی تکمیل میں گذرے۔ اکثر طبائع کا خاصہ ہوتا ہے کہ جوانی کے بعد بڑھاپے میں وہ رنگ نہیں رہتا۔ گویا دلی جذبات بھی جوانی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نواب میرزا داغ دہلوی اس کا ایک خاص نمونہ ہیں جن کے دواوین سے حسب اقتضائے عمر اُن کے جذبات کے تھرمامیٹر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور قدمائے فارسی میں حضرت امیر خسروؒ

دہلوی جیسا قادرالکلام اپنی تصنیفات کو حسب اقتضائے عمر کئی حصوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے بڑھاپے میں اُن کی اُمنگیں جوش زن معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ دوسرے شعرا نے غزلیات و قصائد یا مثنویات عشقیہ و واسوخت سے سروکار رکھا جو آنی اور فانی ہیں جو اپنے تعلقات یا عہد شباب تک باقی رہے۔ اور جب وہ صورت اور وہ حالت باقی نہ رہی تو وہ جذبات بھی رخصت ہوئے برخلاف اُن کے میر انیس کے باطنی جذبات بطور عقیدہ مذہب اُس حسن سے وابستہ ہیں جو آخر دم تک قائم رہنے والے ہیں۔ اور اُس حسن کی تحریک ہر وقت جذبات کو نئی نئی اداؤں سے اُبھارتی رہتی اور قیامت تک اپنے ساتھ رہنے کا یقین دلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر مرتاض صوفیہ کی زندگی میں بڑھاپے کا ضعف اُنکے کلام پر اثر کرتا ہوا محسوس نہیں ہوتا کیونکہ وہ آخر وقت تک حسن مجرد کی اداؤں سے متلذذ ہوتے رہتے ہیں اور وہ لذتیں انکے جذبات کو اُبھارتی رہتی ہیں۔ اسی لئے میں میر انیس کی تصنیف کو بجائے اسکے کہ عمر کے لحاظ سے تقسیم کروں زبان کے لحاظ سے تقسیم کرتا ہوں۔ اور اُسکے تین زمانے قرار دیتا ہوں۔

(۱) ایک وہ جب میر انیس مشق فن کے لئے زمین سخن درست کر رہے اور اُس میں نہایت اعلیٰ درختوں کی قلمیں لگا رہے تھے۔

(۲) دوسرے وہ جب اُن قلموں نے نشو و نما پاکر درختوں کی صورت پیدا کی۔

(۳) تیسرے جب اُس میں پھل پھول نمودار ہوئے۔

اس تقسیم میں پہلا حصہ وہ ہے جس میں میر تقی اور سودا کے بعض الفاظ جو آگے چلکر متروک ہو گئے یا خاص ترکیبیں جن کو آیندہ زمانہ نے متروک کر دیا میر انیس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ باقی دو حصوں میں کسی لفظ یا ترکیب متروک کا نام و نشان نہیں شاعر کا کمال یہ ہے کہ مناظر قدرت اور جذبات فطرت کی تصویر کھینچ دے مثلاً صبح کا وقت جو

جو کیفیت مشاہدہ ہوتی ہے اُس کی تصویر لفظوں میں کھینچ دی جائے۔ اور رنج۔ غم۔ خوشی غصہ وغیرہ جذبات کی حالت جوں کی توں لفظوں میں دکھائی جائے۔ یہ کمال اُردو شاعروں میں میر انیس کا حصہ سمجھنا چاہیئے۔

فردوسی نے شاہنامہ میں پہلوانوں کے فنون جنگ کی تصویریں اس خوبصورتی سے دکھائی ہیں کہ اُس کی نظیر فارسی اور عربی میں نظر نہیں آتی پھر نظامی نے سکندر نامہ میں ہر طرح کی زور آزمائی کی ہے۔ لیکن میر انیس نے مبارزوں کے تیغ و سناں کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ فردوسی اور نظامی دونوں سے بڑھکر مرقع حیرت نظر آتی ہیں ناظرین اس کی تفصیل آیندہ ملاحظہ کریں گے۔

عربی شاعری میں رجز کا خاص حصہ ہے جسکو میدان جنگ سے خاص تعلق ہوتا تھا اُس کی مثال اُردو شاعری میں سوائے مرثیہ گوؤں کے اور کہیں نہیں ملتی۔ میر انیس نے اشعار رجز کو نہایت پُر اثر لفظوں میں بیان کیا ہے جو آپ آیندہ ملاحظہ فرماویں گے۔

میر انیس کی شاعری میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ جس موقع پر جو الفاظ خاص اثر دے سکتے ہیں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور بی بی اور کنیز اور آقا و خادم چھوٹے بڑے کے مخصصات ادب کے لئے جو الفاظ مناسب ہیں وہی صرف کرتے ہیں۔

میر انیس ثقیل لفظوں اور تعقید کلام کو بالکل ناپسند کرتے ہیں۔ اور اُنکو کیسا ہی مضمون ہاتھ لگے لیکن جب تک وہ فصیح لفظوں کو ڈھونڈھ نہیں لیتے۔ اُس مضمون کو داخل نظم کرنے پر متوجہ نہیں ہوتے۔ میر انیس کا کلام بلاغت کی جان، سلاست کی روح اور فصاحت کی کان ہے۔

میر انیس فصیح لفظوں کو اس خوبی سے ترتیب دیتے ہیں جیسے جڑیا نگینوں کو نہایت صحیح مناسبت کے ساتھ تھیوں میں بٹھاتا ہے۔

میر انیس کا روزمرہ اتنا صاف اور منجھا ہوا ہے جو لکھنؤ جیسے شہر میں بے مثل مانا جاتا رہا ہے۔ ان کی روزمرہ کی بول چال پر تمام لکھنؤ مٹا ہوا ہے جو اُن کی شاعری کی جان ہے۔

میر صاحب کے تسلسل بیان میں وہ خوبی ہے کہ کہیں سے کوئی کڑی علاحدہ ہی نہیں ہوتی۔ اور ایک کڑی دوسری کڑی سے اس خوبصورتی کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو پہچانی نہیں جاتی۔ جیسے مرصع زیورات میں اعلیٰ کاریگر کا لگایا ہوا ٹانکا جو بالکل وصل ہو جاتا ہے اور دو حصوں کو وصل کر دیتا ہے۔

فردوسی نے بہت سے بادشاہوں اور پہلوانوں کی لڑائیوں کو مختلف طور سے لکھا ہے لیکن میر انیس نے کربلا کی ایک مختصر جنگ میں وہ تمام سامان دکھائے جو بعض شاہنامہ میں بھی نظر نہیں آتے۔

میر انیس کے کلام سے ہر موقع کے مناسب حال وہی اثر پیدا ہوتا ہے جو اُس واقعہ یا اُس حالت کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

میر انیس جوان۔ بوڑھے بچے کی مقتضائے فطرت کے موافق کلام کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور یہ تینوں فرق اُنکے کلام سے علاحدہ علاحدہ محسوس ہوتے ہیں۔

میر انیس کو ایک مشکل یہ پیش آئی ہے کہ میدانِ جنگ میں امام علیہ السلام یا حضرت عباسؑ یا اور عزیز و انصار کے مقابلہ میں جو نامی پہلوان آئے ہیں اُنکے اوصاف مردانگی و پہلوانی کے اظہار کو بھی وہ الفاظ تلاش کئے ہیں جو فریق مخالف کے حسب حال ہو سکتے ہیں۔ اور انکی شقاوت و دلیری تنومندی دائوں پیچ شہسواری اور اُن کے اسلحۂ جنگ اور میدان جنگ میں اُنکے گھوڑوں کی جست و خیز کا نقشہ برابر برابر کھینچتے گئے ہیں۔ اُن کو کسی تعریف کا بھوکا نہیں رکھا۔

لکھنؤ ایک بہت ہی خود پسند شہر ہے۔ یہاں کا کوئی اہل کمال دوسرے شہر والوں

کو اپنے سے بڑا کہنا نہیں جانتا بلکہ خود لکھنؤ کے بڑے بڑے کہن مشق ان کی چوٹوں سے خالی نہیں رہے۔ یہ میر انیس ہی کا حصہ ہے جو وہ اول سے آخر تک ہر طبقہ اور درجہ کے لوگوں میں فرو فرید مانے گئے اور حاضر و غائب کسی کی مجال نہ ہوئی جو اُنکی نسبت زبان کھولتا۔ اور جو میرزا دبیر کی طرف کے کچھ لوگ زبان درازی کر بیٹھتے تھے وہ ایک طرح کی جلی کٹی سمجھی جاتی تھی باقی ہیچ۔

اسی طرح دلی کے تمام زبان آور میر انیس کے دلدادہ پائے گئے۔ میرزا غالب ایسی لاثانی قدرت کلام پر میر انیس کا دم بھرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میر انیس کے مقابلہ میں دوسرے کا مرثیہ کہنا میر انیس نہیں بلکہ خود مرثیے کا منہ چڑھانا ہے۔ اور آج تک دلی اور لکھنؤ میں میر انیس کی مرثیہ گوئی کو معجزہ کلام مانا جاتا ہے۔

مفتی میر عباس صاحب ادیب کانپوری انار اللہ برہانہ جن کے فضل و ادب کا زمانہ معترف ہے میر انیس کے کمال شاعری کو معجزہ کلام فرمایا کرتے تھے جناب مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر لکھنوی جو علاوہ مذاق اُردو کے انگریزی شاعری میں بھی کمال رکھتے ہیں جن کی نسبت میر انیس کے خلف الصدق میر نفیس مرحوم نے ایک ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ آپ کی داد کو ایک ہزار آدمی کی داد کے برابر مانتا ہوں میر انیس کی نسبت خدائے سخن سے کم درجے کے الفاظ بولنا سوء ادب تصور فرماتے ہیں۔

پیرس اور انگلستان کی علمی سوسائیٹیوں میں جہاں مشرقی زبانوں کے نامور سخن طرازوں کی قدر کی جاتی ہے۔ اُردو زبان کے لئے میر انیس کو سیر و تسلیم کیا گیا ہے اور جناب مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے ڈبلن کی یونیورسٹی میں میر انیس کی کمال شاعری کی بصراحت داد دی ہے لیکن کمال افسوس کی بات ہے کہ میر انیس کے کلام کا کثیر حصہ جو چار یا پنج جلد نہیں چھپنے سے باقی رہگیا وہ جہاں تہاں ایسی حالت میں ہے کہ اگر وہ پریس تک نہ لایا گیا تو بتدریج دوسری صورتوں میں منتقل ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کرتا ہے۔

انگریزی شاعری کے مقابلہ میں اردو شاعری

اور

انگریزی شاعروں کے مقابلہ میں میر انیس اور اردو شاعر

ایک نہایت ضروری مضمون ہاتھ لگا ہے جو ہمارے مخدوم و مکرم مولوی زکی الدین صاحب رئیس کاکوری کے فرزند اکبر مسٹر امیر احمد صاحب علوی بی اے کی محققانہ تحقیق و تنقید کا نتیجہ ہے۔ ایک ٹیبل کے ایک سرے پر ایک انگریزی لیمپ روشن ہے جس میں کیروسن آئل بھرا ہوا ہے۔ دوسرے سرے پر ایک فانوس میں شمع کافوری جل رہی ہے جو چربی، موم، کافور وغیرہ سے بنائی گئی ہے۔ کیمسٹری کے جاننے والے دونوں گیسوں کے اجزا رکے موثرات کو دریافت کرلیں کہ انگریزی لیمپ کا گیس ہوا کے ذروں میں مل کر کیا اثر پیدا کرتا ہے۔ اور شمع کافوری کے ہوائی اجزا سے کیسی تاثیر پیدا ہوتی ہے مجکو یقین ہے کہ اس مضمون کو اس کتاب کے پڑھنے والے عموماً اور انگریزی تعلیم یافتہ خصوصاً دلچسپی اور امعانِ نظر سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ مضمون انگریزی خوانوں کو ایک اعلیٰ درجہ کی دوربین کا کام دینے والا ہے جس سے وہ دونوں شاعریوں کو دور سے دیکھ سکتے ہیں اور ہر ایک کے خط و خال اور حسن و جمال کے سونے کو حسن مذاق کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔ میں اس مضمون سے صرف وہی حصہ لیتا جو میر انیس سے متعلق ہے لیکن ایسی صورت میں اس تصویر کا حسن بہت کچھ گھٹ جاتا اور انگریزی اور اردو شاعریوں کا مقابلہ جو اس وقت میں ایک ضروری خیال ہے نہ ہو سکتا اس لئے

میں کسی قدر تفصیلی اقتباس کرتا ہوں۔

وَہُوَ ھٰذا

کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری مخرب اخلاق ہے۔ اس میں فطرتی جذبات اور بلند خیالات کا پتہ نہیں۔ وہ خلاف قیاس تشبیہوں اور بیہودہ استعاروں سے مملو ہے۔ فلسفیانہ مضامین اور کارآمد فنون کا اُس میں کہیں ذکر نہیں۔ اور وہ یورپ کی سچی نیچرل اور دلچسپ شاعری کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتی۔

کون کہتا ہے؟ ہمارے ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل جس کی ترقی اور تنزل پر ہماری قوم کا آئندہ عروج یا زوال منحصر ہے۔ اور جس نے مغربی تعلیم کی برکتوں سے فیضیاب ہو کر بجائے خود یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُردو شاعری اس قابل نہیں ہے جس کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔

اگر وہ شخص جس کو ہماری تمدنی ترقیوں سے دلچسپی نہو ان خیالات کا حامی بنے تو ہم کو شکوہ و شکایات کا حق حاصل نہیں، لیکن دل پر چوٹ لگتی ہے جب خیال آتا ہے کہ یہ عقائد اس نئی نسل کے ہیں جو مقدس اسلاف کی قابل یادگار خیال کی جاتی ہو اور جسکی طرف اسوقت سب کی نگاہیں بڑی امیدوں سے لگی ہوئی ہیں کیا ترقی اور عروج کی امید کی جا سکتی ہے اُس گروہ سے جو فرحت و انبساط کے اصلی ذریعے اور کل دنیوی ترقیوں کے سچے وسیلے سے بہرہ اندوز ہونا ہی نہیں چاہتا۔ کیونکہ بقول "کارلائل" کے کسی قوم نے حیات جاوید حاصل نہیں کی جب تک کہ اُس میں کوئی قادر الکلام شاعر پیدا نہیں ہوا، اور نظم میں شعر ہی کی وقعت نہ رہی تو ایسا شاعر پیدا ہونا معلوم!!

کیا وہ ہندوستان کے باشندے جو اردو شاعری کو نام دھرتے ہیں اس خیال میں

ہیں کہ انگلستان کے شاعروں کے فیض سے وہ اُس کھوئے ہوئے جوہر کو حاصل کریں گے جس کی طرف کارلائل نے اشارہ کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اُردو شاعری کو بُرا کہنے، گالیاں دینے، اور اُس پر ہر قسم کے الزام لگانے کا تمہیں اختیار حاصل ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ انگریزی نظموں میں وہ کونسے جوہر ہیں جو تمہارے یہاں تلاش سے بھی دستیاب نہیں ہوسکتے اور تمہاری شاعری میں کیا بُرائی ہے جس کا نمونہ انگلستان میں موجود نہیں۔

انگلستان کے شعرا نے ایک اعلیٰ درجہ کی نظم کے لئے جو اوصاف ضروری قرار دیئے ہیں وہ تمہاری شاعری میں موجود ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو کس حد تک۔

شیلی جو پچھلی صدی عیسوی میں ایک مسلم الثبوت شاعر گذرا ہے اور جس کی ہر لعزیزی کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ ابھی حال میں اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند خط لندن میں تقریباً آٹھ ہزار پر نیلام ہوئے ہیں اور امریکہ کے ایک جوہر شناس نے اُن کو خرید کیا ہے نظم کی تعریف یوں کرتا ہے۔

"شاعری نیچر کی پوشیدہ دلفریبیوں کے چہرہ سے نقاب اُٹھا دیتی ہے اور اسکے اثر سے ہم کو نامانوس چیزیں مانوس معلوم ہونے لگتی ہیں۔

دیکھو شیلی نے کس قدر مختصر الفاظ میں کل مغربی شاعری کا نتیجہ ظاہر کر دیا ہے۔ فی الحقیقت یورپ میں شعر گوئی کا مقصد صرف یہی ہے کہ شاعر کی اُس گہری نظر سے جو دنیا کی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بغور دیکھتی ہے جن کو عوام الناس معمولی سمجھ کر خارج از ذہن کر دیتے ہیں ہر شخص مستفید ہو اور وہ نیچر کی کل نزاکتوں اور لطافتوں سے حظ اُٹھانے کا عادی ہو جائے اور کم سے کم اُس حسن و خوبی کو تو ہرگز فراموش نہ کرے جس کو شاعر نے ایک خوش اسلوبی سے اس لئے موزوں کر دیا ہے کہ یاد رکھنے میں سہولت ہو۔

ہمارے ملک اور نیز ایران میں جس کے خیالات سے ہم بہت دنوں تابع رہے شاعری کا موضوع نہ تھا۔

یہاں روحانیت اور فلکیات سے فرصت ہی نہ تھی کہ اجرام و اجسام کی طرف متوجہ ہوتے تاہم اگر تم شیلی ہی کے قول کو معیار سخن بناؤ اور اسی محک پر نظم کا کھوٹا کھرا پرکھنا چاہو تو تم کو اردو شاعری کے سدا بہار گلشن میں ایسے اشعار کا ایک معقول سرمایہ مل جائیگا جو یورپ کی اعلیٰ بلند پروازیوں کا مقابلہ کر سکے۔

ایک معمولی بات ہے کہ ہر سال خزاں آتی ہے درختوں کے پتے زرد ہو کر گر جاتے ہیں۔ ایک مقررہ میعاد کے بعد بہار کا موسم آتا ہے اور باغ دوبارہ سرسبز ہو جاتا ہے یہ نیچر کی ایک معمولی کارروائی ہے جسکو ہم مدت العمر سے دیکھ رہے ہیں اور کوئی نئی بات اس میں نہیں معلوم ہوتی۔ اب اگر شاعر ہمارے دل پر یہ حسن نقش کرنا چاہتا ہے تو وہ یہی معمولی بات اس خوبی سے بیان کریگا کہ ایک اچنبا سا ہو جائے اور دل میں بات گڑ جائے وہ یوں کہے گا:۔

بہار آئے الٰہی چمن پری ہو جائے ۔۔۔ یہ زرد زرد ہر اک شے ہری ہری ہو جائے

تم کہو گے کہ بہار کا موسم چونکہ مے پرستی اور عیاشی کے لئے نہایت موزوں ہے اور مشرقی شعرا نے اس فصل کی تعریف میں بہت خامہ فرسائی کی ہے اس لئے ہزار میں ایک شعر ایسا بھی نکل آیا جو شیلی کے معیار سے صحیح اترتا ہے۔ لہذا تصویر کا دوسرا رخ دکھاتا ہوں۔

نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی ۔۔۔ بہت سی گرد بہت سا غبار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ۔۔۔ ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

صبح کا سہانا سماں تم روز دیکھتے ہو۔ دیکھو ایک شاعر پچھلے پہر کی پوشیدہ دلفریبی کے چہرے سے کیا عجیب و غریب پردہ اٹھاتا ہے اور تمہیں کیا عمدہ بات

سمجھاتا ہے ؎

محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ حال اور ہم کو — کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

یہ اشعار غالباً شبلی کے قول کا مطلب سمجھانے کے لئے کافی ہیں اور اس دعوے کا بھی ثبوت دے سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ مقولہ ہمارے جادو نگار شاعروں نے کبھی پیش نظر نہیں رکھا اور نہ وہ اُس کو شعر کا موضوع لہ سمجھتے تھے تاہم وہ اکثر موقعوں پر بے ساختہ ایسے اشعار کہہ گئے ہیں جن میں یہ صنعت بدرجۂ کمال موجود ہے۔

تم کو میر اور میر درد کے کلیات میں ایسے اشعار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ سید انشا بھی کبھی کبھی نیچر کے جلوے دکھا جاتے ہیں۔ آتش و غالب کے دواوین میں بھی اسکی جھلک نظر آجاتی ہے اور نظیر اکبر آبادی کا وہ کلام جو پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ابھی حال میں مرتب کیا اور مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں چھپوایا ہے اس قسم کے اشعار۔ غزلوں۔ اور قصائد وغیرہ کا معدن ہے۔

انگلستان ہی کے ایک فلاسفر کا قول ہے کہ "شاعری اور اخلاق ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں"۔ جو عہد کہ عبادت و دینداری کے لئے مشہور ہے اُس کی شاعری بھی عموماً پاکیزہ ہوتی ہے اور جس زمانہ میں آوارگی اور بدچلنی کا عام رواج ہوتا ہے اُس وقت کی شاعری بھی اکثر مخرب اخلاق ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس زمانہ میں انگلستان کو عیسائیوں کا پیورٹن فرقہ ترک لذات اور دنیا فراموشی کی تعلیم کر رہا تھا ملٹن پیدا ہوا اور جب شاہ جارج چہارم کا دور دورہ تھا بائرن کی دھوم مچی۔ یا یوں کہو کہ جب خدا شناسی اور معرفتِ حق کے چرچے تھے مرزا مظہر جانجاناں اور میر درد پیدا ہوئے اور جب

واجد علی شاہی رنگ محل اپنے دلکش تماشے دکھا رہے تھے جان صاحب اور نواب مرزا نے مقبولیت عام حاصل کی۔

اگر انیسویں صدی کی ابتدا میں انگلستان کا ملٹن فلکیات کی تشریح کرنا یا نصیر الدین حیدر کے دربار میں میر درد عشق حقیقی کا وعظ دیتے تو نہ عوام کے دل پر بات جمتی اور نہ اُن کو شہرت عام کے دربار میں جگہ ملتی جس گروہ کے لئے شاعر نے شعر کہا ہے اُس کے خیالات کی تبعیت شاعر کا پہلا فرض ہے اور اگر اس دائرے سے بال برابر سرکا ہے تو جو کیفیت اُسکو بیان کرنا مقصود ہے سامع کے دل پر نقش نہ ہوگی اور نظم کا مقصد اعلیٰ فوت ہو جائے گا۔

وہ کوتاہ نظر ناعاقبت اندیش جنہوں نے نہ انگریزی سوسائٹی کے رسوم و قواعد پر غور کیا ہے اور نہ وہاں کی اعلیٰ شاعری کو نکتہ چینی کی نظر سے دیکھا ہے اپنی قومی شاعری کا رنگ مٹانیکو کہدیتے ہیں کہ وہ مخرب اخلاق ہے حالانکہ مقابلہ کرکے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہمارے شعرا نے باوجود بیحد آزادی اور بیباکی کے کبھی اس قدر محرک خیالات کو نظم نہیں کیا جتنا کہ انگریزی شعرا کے کلام میں ملے گا اور جو بعض فضول گو بیہودہ نویسوں نے فحش بکا بھی ہے تو وہ اُس قدر بُری طرح اور ایسی بے حیائی سے بیان کیا ہے کہ ہنسی تو چاہے آجائے مگر دل میں خاک اثر نہ ہوگا۔ اور جب دل پر اثر ہی نہوا تو مخرب اخلاق ہونا معلوم!!

البتہ انگلستان کی اعلےٰ شاعری کی سیر کرو۔ وہاں کے سائنٹفک اور عالی دماغ شعرا کا کلام دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بدوضعی اور آوارگی کا دلکش فوٹو ایسی خوش ادائی سے اتارتے ہیں اور اس کی تعریف و تشریح میں اس قدر نیچر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں کہ زاہد صد سالہ بھی سُنے تو تسبیح و مصلا چھوڑ کر بیپیالہ ہو جائے۔

بائرن نے ڈان جوان (Don guan) میں اپنے ملک کی تہذیب کا جو کچا چٹھا بیان کیا ہے اور جن فحش و گندہ الفاظ میں وہ لکھا ہے اور جس قدر بُرا اثر وہ عوام کے قلوب پر ڈالتا ہے اُس کی مثال ہمارے یہاں جان صاحب اور میاں عصمت کے کلام میں بھی نہ ملے گی۔

شیکسپیر نے ریپ آف لیوکریشیا (Rape of Lucretia) میں جو دیا سلائی کے کمسن جوانوں کے دل میں آگ بھڑکانے کے لئے کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دیئے ہیں اُنکے سامنے طلسم الفت، میر حسن اور بہار عشق کے وہ سین جن کو دیکھ کر آج تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بھنویں تن جاتی ہیں گرد ہیں۔

ملٹن کے سے زاہد خشک نے پیر ڈیائز لاسٹ Paradise Lost میں اپنی جدہ محترمہ یعنی ایڈم Adam کی بی بی ایو Eve کو برہنہ کر کے اُنکے اعضائے جسمانی کی جو تشریح کی ہے اُس بیحجابی کی مثال خدا کا شکر ہے کہ ہماری شاعری میں نایاب ہے اور وہ مؤثر نظم جو انگلستان میں برائیڈس کنفیشن آف دی فرسٹ نائٹ Bride's Confession of the first night کے نام سے مشہور ہے اور جس کا نام صفحہ قرطاس پر رقم کرتے ہوئے قلم مست ہوتا ہے اس قابل ہے کہ اُس نئی تعلیم یافتہ نسل کو جو انگلستان کی ہر دلعزیز ادا پر جان دیتی اور اُسکے ہر فعل کو معراج تہذیب و کمال شائستگی سمجھتی ہے عرق شرم میں غرق کر دے اور مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھے۔

وہ نظمیں جو آج انگلستان کا سرمایۂ ناز و افتخار ہیں اور جن کو انگریزی لٹریچر کی بزرگ الماریوں میں معزز جگہیں دیجاتی ہیں سرتاپا فحش و گندہ خیالات سے بھری ہوئی ہیں لیکن خدا کی شان ہے کہ ہماری شاعری جو ہمیشہ اخلاق کی اعلیٰ تعلیم دینے کا بیڑہ اٹھائے رہی جسکا ایک معتدبہ حصہ۔ تصوف، معرفت پند و نصائح۔ وعظ و تلقین۔ اور خدا ترسی

کی تعلیم پر وقف رہا اور جس کا بہترین حصہ مخش و گندہ خیالات سے بالکل الگ رکھا گیا آج اُس نئی نسل کے ہاتھوں سے جس نے انگریزی شاعری کا نمونہ اُن منتخب نظموں کو سمجھ لیا ہے جو مدارس کے ابتدائی درجوں میں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اور جن کے مضامین اس قسم کے ہوتے ہیں کہ "اے اونٹ تو بڑا اسید ہا اور حلیم الطبع ہے اور تجھ میں بچوں کی سی نکیجتی ہے" یا "کالن کے پاس دو نئی بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک بھی نہیں" مخرب اخلاق سمجھی جاتی اور اس قابل نہیں خیال کی جاتی ہے کہ مہذب جلسوں میں اس کا ذکر کیا جائے اور وہ شاعری جو بدکاری اور آوارگی سکھانے کا سچا آلہ، خیالات کو گندہ اور خراب کرنے کا سہل الوصول ذریعہ، اور زاہد پاکباز کو بھی ایک رندِ سیہ مست بنا دینے کا مجرب نسخہ ہے فلسفیانہ نزاکتوں سے مملو کہلاتی ہے۔

زنہار از دورگیتی و انقلاب روزگار درخیال کس نگشتی کانچناں گردد چنیں

ملٹن کہتا ہے "سب سے عمدہ نظم وہ ہے جو سادہ نازک خیال اور موثر ہو" سادہ نظم سے یہ مراد ہے کہ عبارت پیچدار نہو اور قوانین فطرت سے تجاوز نہ کیا ہو۔

اس مقام پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ قانون فطرت شاعرانہ اعتبار سے دو قسم کا ہوتا ہے اول تو فطرت کے وہ معمولی اصول و ضوابط جنکا بنی نوع انسان پر اثر پڑتا ہے اور جن سے سب بیش و کم مانوس ہوتے ہیں اور دوسرے وہ قواعد بائرن نے

ملٹن کے اصلی الفاظ یہ ہیں (Simple, Sensuous & passionate) ان مبہم الفاظ سے انگلستان کے دانشمندوں نے مختلف معانی پیدا کئے ہیں اور اردو میں بھی انکا ترجمہ کئی طرح ہو سکتا ہے مگر میں نے اُس تشریح کو ترجیح دی ہے جو بائرن کے مشہور معاصر نے ہنٹ نے بحوالہ رچرڈسن تحریر کی تھی اور اُسی تشریح کو پیش نظر رکھ کر میں نے ان الفاظ کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس تشریح کو ترجیح دینے کی یہ وجہ تھی کہ اُردو شاعری اس معیار سے بالکل صحیح اُترتی ہے بلکہ ملٹن کی کل عبارت پڑھنے سے یہی معنی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں اور اب انگلستان میں عام طور پر ان الفاظ کا وہی مطلب سمجھا جاتا ہے جو میں نے اس مضمون میں درج کیا ہے۔ ۱۲ (مؤلف)

جو اگرچہ عام فطرت کے خلاف ہیں۔ مگر شاعر نے کسی ضرورت سے اُن کو جائز کر لیا ہے۔

یہ موخر الذکر اصول اکثر خلاف قیاس باتوں پر مبنی ہوتے ہیں اور نیچر کی سچی تصویر نہیں ہوتی لیکن اُن کی صحت و غلطی کا امتحان عام فطرت کے اصول سے نہیں کیا جاتا بلکہ انکی جانچ اُن ہی قواعد سے کی جاتی ہے جو شاعر نے پہلے ہی فرض کر لئے ہیں۔ مثلاً شکسپیر نے میکبتھ (Macbeth) میں چڑیلوں یا ڈائنوں کو اسٹیج پر بلایا ہے۔ ٹمپسٹ (Tempest) میں جادو کا کھیل اور پریوں کا ناچ دکھایا ہے۔ مڈسمر نائٹس ڈریم (Midsummer nights' dream) میں جنوں اور پریوں کے افسانے لکھے ہیں اور اُن پر انسانوں کے ساتھ عشق و عاشقی کا الزام لگایا ہے یا خود ملٹن ہی نے پیرڈائز لاسٹ (Paradise Lost) میں فرشتوں کو انسانی خواص عطا کئے ہیں۔ شیطان کی فوج اور خداوند لایزال کے لشکر سے آسمان پر لڑائی کرائی ہے جس میں بجائے ہتیاروں کے پہاڑیاں اور درخت استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک شیطان سے توپ ایجاد کرائی ہے اور خدا کے لشکر کو ایک دن شکست دلائی ہے پھر خدا کے فرزند کو طلائی گاڑی پر سوار کرا کے میدان جنگ میں روانہ کرایا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ باتیں دنیا کے مقررہ اصول نیچر کو دیکھتے خلاف قیاس۔ بعید از عقل۔ اور بالکل خبط ہیں۔ مگر شاعر نے جب ایک امر محال کو ممکن کر لیا۔ اور اُسی ایجاد کردہ دائرہ میں اُس نے اپنے خیالات کو ظاہر کر لیا تو ہم اس پر یہ اعتراض ہرگز نہیں کر سکتے کہ اُس نے ایک غیر ممکن بات کیوں فرض کی البتہ اگر وہ اپنے ایجاد کردہ نیچر کے قواعد سے خود ہی کسی جگہ بھول کر یا بالقصد روگرداں ہو جائے تو ہم کہہ سکیں گے کہ اُس نے فطرت کا جو نیا قانون بنایا تھا اس کی پابندی خود نہ کر سکا اور یہ اُس کی طبیعت کی کمزوری اور شاعری کی خامی کی کافی دلیل سمجھی جائے گی۔

اب اس تشریح کے بعد اُردو کے کل اعلیٰ شاعروں کے کلام پر بالاستیعاب نظر ڈال کر کیا ایسے اشعار کی کوئی بڑی فہرست تیار کر سکتے ہیں جو قوانین فطرت کے خلاف ہوں اور ملٹن کے معیار سے پورے نہ اُتریں؟ اگر جن و پری، سحر و معجزہ کا ذکر ہوگا تو ہم کہیں گے کہ یہ فطرت شاعر کی ایجاد ہے۔ اگر حسن و نزاکت کی تعریف میں کوئی خلاف قیاس تشبیہ یا بیجا مبالغہ ہوگا تو ہم کہیں گے کہ یہ حسن کی فرضی تصویر ہے۔ اگر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کے کارنامے یاد دلائے ہونگے یا گل و بلبل کے عشق و عاشقی کا بیان ہوگا تو ہم کہیں گے کہ ملکی خصوصیت ہے! مگر تم نا اُمید نہو۔ کوشش کرو۔ کمر ہمت مضبوط باندھو۔ اساتذہ کے دواوین پر بسبیط نظر ڈالو۔ مثنویوں کی خاک چھانو۔ ممکن ہے کہ تم چند ایسے خلاف قیاس مضامین تلاش کر لو جن کا کچھ جواب نہو سکے۔ اور میرے دعوے کی تردید ہو جائے مگر یہ فائدہ تو مجھ کو ضرور حاصل ہوگا کہ اسی حیلہ سے تمہاری شاعری کے وہ گراں بہا اور نایاب جوہر جن پر کئی سال سے زمانہ غفلت و عدم توجہی کے گرد و غبار کا انبار لگا رہا ہے اپنے حسن عالم افروز کی جھلک سے تمہاری نظروں میں چکا چوند پیدا کر جائیں گے اور اُس وقت تمہاری حب الوطنی کا دبا ہوا جوش اُبھر آئیگا اور تم بھی کہنے لگو گے کہ ہمارے شعرا نے جو کچھ کہا خوب کہا اور ایسا کہا ہے کہ اُس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ نیچر کے اصول کے پابند ہوں یا نہ ہوں۔ سچ کہتے ہوں یا جھوٹ بولتے ہوں۔ سادگی ظاہر کرتے ہوں یا بناوٹ اور تکلف کا سبق پڑھاتے ہوں مگر اُن کے کلام میں ایک خاص دلکشی ہے۔ جو بارن اور شیلی کے بس کی نہیں اور جس سے ہمارے دل کو وہ فرحت اور ہماری طبیعت کو وہ سرور حاصل ہو جاتا ہے جو کل شاعری کا سچا موضوع ہے۔

ملٹن نے اعلیٰ شاعری کے لئے دوسرا ضروری جزو نازک خیالی کو قرار دیا ہے۔ جس سے یہ مطلب ہے کہ شاعری کو نئی نئی تشبیہیں اور تمثیلیں دکھا کر نظم کو دلچسپ

بنانا چاہیئے۔ اس مبحث پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہماری تشبیہوں اور استعاروں کی نزاکت مسلم بین الفریقین ہے مگر بدقسمتی ہے کہ یہی جوہر جس کی انگلستان والے جستجو کرتے ہیں اور نہیں ملتا۔ ہمارے یہاں بافراط ہے اور نظر میں نہیں جچتا بلکہ اردو شاعری میں جو نقائص بتائے جاتے ہیں اُن میں سے ایک بہت بڑا عیب یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُردو شاعری میں بعض جگہ ضرورت سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے کبھی صرف لفظی رعایتوں کو پیش نظر رکھ کر اشعار میں نزاکت پیدا کی گئی ہے۔ اور کہیں استعاروں کے پیچ میں پھنس کر اصل مطلب گاؤخور ہو گیا ہے لیکن ایسی مثالیں شاذ ہیں اور ان سب کی طرف سے یہ جواب کافی ہے کہ جب نازک خیالی ایک شاعرانہ جوہر ہے تو جس درجہ کمال تک وہ پہنچایا جائے اُتنا ہی زیادہ شاعرانہ خیالات کی پختگی سمجھی جائے گی۔

ملٹن کے نزدیک اعلیٰ شاعری کے لئے تیسرا ضروری جوہر یہ ہے کہ وہ موثر ہو۔ تاثیر کی بھی کئی قسمیں ہیں کبھی حسن و عشق کی تصویریں دکھانا منظور ہوتی ہیں کبھی ہنسانا اور تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا مقصود ہے۔ کبھی حسن و عشق کی تصویریں دکھانا منظور ہوتی ہیں کبھی پند و نصائح۔ وعظ و تلقین سے اخلاقی خوبیاں سمجھانا مدنظر ہوتا ہے۔ کبھی بجھی ہوئی طبیعتوں میں جوش پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کبھی شاعر کا منشا صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ سامعین کے دلوں میں ایک قسم کا سرور پیدا کر دے غرض یہ یا اسی قسم کی اور کوئی تاثیر اگر شاعر انسان کے دل میں پیدا کرا دے تو کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی نظم موثر ہے۔

یہ وصف بھی ہماری شاعری میں موجود ہے۔ اگرچہ ہر قوم، ہر ملک، اور ہر زبان کے اشعار بعض اچھے اور بعض بُرے ہوتے ہیں۔ اور اس سبب سے اردو کی بھی وہ اشعار

جو بیہودہ اور خبط ہوں ممکن ہے کہ کوئی خاص اثر پیدا نہ کریں مگر جو کلام موزوں کچھ بھی معنی رکھتا ہوگا ایک قسم کا اثر ضرور پیدا کرے گا خواہ وہ سرسر یع الزوال ہو یا پائدار۔ البتہ ملٹن کا اصول پیش نظر رکھو تو کہنا ہوگا کہ جو نظم زیادہ اثر پیدا کرے یا جس کا اثر زیادہ دیر تک قایم رہے زیادہ عمدہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ جب تک شاعر کے دل میں درد نہیں ہوتا اور بقول کارلائل کے وہ وہ اظہار خیالات میں صادق البیان نہیں ہوتا اُس کے کلام کا اثر قائم نہیں رہتا مگر عالم اسباب کے واقعات کو بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دروغ کو بھی فروغ ہو جاتا ہے اور اسی طرح اگر تم اگلے اُستادوں کے دواوین دیکھو۔ ہمارے سرمایہ ناز مثنویوں کی ورق گردانی کرو تو معلوم ہوگا کہ اُن کا ہر ہر شعر خنجر و نشتر کا کام دیتا ہے بلکہ الماس کا قلم شیشہ کو اس صفائی و سرعت سے نہیں تراش سکتا جتنی آسانی سے اُن کا ایک ایک مصرعہ دل و جگر پر چرکے لگاتا ہے۔

میں اس وقت مثالاً دس پانچ شعر لکھے دیتا ہوں اور اُنکے موثر یا غیر موثر ہونے کا انصاف تمہارے ہی اوپر چھوڑتا ہوں۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جا دو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

---

۱ یہ عشرت و عیش و شادمانی کب تک — عشرت بھی ہوئی تو نوجوانی کب تک
گر یہ بھی سہی قیام دولت ہے محال — دولت بھی ہوئی تو زندگانی کب تک

۲ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہمکو غریب جانکے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُسکو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

۳ ہر دم سنے ہے انیس زباں پر خدا خدا — بھر جہا نہیں کون کسی کا ہے آشنا

دلداری و محبت و دلجوئے و وفا　　معدوم ہیں بصورتِ عنقا و کیمیا

گستاخ ہو کے عرض کیا ہے معاف ہو

ہم نے تو ایک دل بھی نہ پایا کہ صاف ہو

۴ یہ عیش کہتے ہو موقع نہ تھا اور گھات نہ تھی　　مہندی پاؤں میں تھی آپکے برسات نہ تھی

دن کو آسکتے نہ تھے آپ تو کیا رات نہ تھی　　کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی

بس یہی کہئے کہ منظور ملاقات نہ تھی

۵ اُٹھا ہے شام ہی سے آج درد پہلو میں　　سحر تک ایرے پروردگار کیا ہوگا

۶ خدا ہی خیر کرے آج رنگ بیڈھب ہے　　تپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

۷ پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے　　حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

۸ ہم قفس میں اور گل سے باغ میں صیاد کی دھوم　　دیکھکر اودی گھٹا زندانیں بھر آتا ہے دل

ابتک تو ہم اُن خوبیوں پر جو ملٹن نے شاعری کے لئے ضروری قرار دی ہیں فرداً فرداً بحث کر رہے تھے اور دکھا رہے تھے کہ ہماری شاعری قوانین فطرت کے خلاف نہیں۔ اُس میں نازکخیالی بدرجۂ کمال موجود ہے اور ایک خاص قسم کا اثر بھی قلوب میں پیدا کرتی ہے مگر اب ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ہی نظم میں یہ تینوں جوہر جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں کیونکہ ملٹن کا منشا یہی ہے کہ ان اوصافِ ثلثہ کو ایک ہی نظم میں جمع ہونا چاہیے اور جب تک ان کا اجتماع نہو گا شعر اچھا نہ سمجھا جائیگا۔

ملٹن نے جو بعض اشعار میں ان قیود کی پابندی کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگلستان ہی کا ایک نکتہ چیں اُسکے کلام کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ پڑھنے کے قابل نہیں بعض اور شعرا نے بھی اس اجتماع ثلثہ کا لحاظ رکھا تھا مگر جب تک کوئی ایک قید ترک نہیں کی شعر میں مزا پیدا نہیں ہوا۔

البتہ ہمارے ملک کی اعلیٰ شاعری میں یہ دشوار اجتماع اس خوبی سے خود بخود ہو گیا ہے کہ

الہام کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت مقابلہ کے لئے میں ایک ہی قسم کے مضامین پر مغربی اور مشرقی شعرا کی زور آزمائیاں دکھاتا ہوں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ کرنے سے نظم کی خوبیاں باقی نہیں رہتیں اس لئے اصل انگریزی نظم تحریر کرتا ہوں اور مختصراً اُس کا مطلب بھی اُردو میں لکھ دیتا ہوں

شیکسپیئر صبح کا سین یوں بیان کرتا ہے۔

Lo! hear the gentle lark weary of rest.
From his moist cabinet mounts up on high,
And wakes the morning from whose silver breast
The sun ariseth in his majesty;
Who doth the world so gloriously behold
The cedar-tops and hills seem burnished gold.

اب نازک اندام لوا کافی آرام کر چکنے کے بعد اپنے آشیانہ سے نکل کر آسمان پر پرواز کرتا ہے۔ صبح کا سپیدہ پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ اور آفتاب شوکت و عظمت کے ساتھ طلوع ہو کر دنیا پر ایسی پُر فیض نگاہ ڈالتا ہے کہ درختوں کی چوٹیاں اور پہاڑیاں طلائی احمر کی بنی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ملٹن صبح کی دلفریبی یوں ظاہر کرتا ہے۔

The sun, who, scarce up-risen,
With wheels yet hovering o'er the ocean brim,
Shot parallel to the earth his dewy ray,
Discovering in wide landscape all the East
Of Paradise, and Eden's happy plains.

آفتاب جو ابھی پورا طلوع نہیں ہو چکا اور جس کا ایک حصہ ابھی چشم مردم سے نہاں ہے
اپنی شعاعیں کرنیں سطح ارض کے متوازی پھیلاتا ہے۔ اور عدن کے دلکش اور خوش
سواد میدانوں اور فردوس کے مشرقی منظروں کو نورانی بنا دیتا ہے۔
فیچر صبح کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

See the day begins to break,
And the light shoots like a streak,
Of subtile fire, the wind blows cold,
While the morning doth unfold;
Now the birds begin to rouse,
And the squirrel from the boughs
Leaps, to get him nut and fruit;
The Early lark that erst was mute,
Carols to the rising day
Many a note and many a lay.

اب پو پھٹنا شروع ہوئی اور روشنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔
اور صبح کا حسن رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ سب چرند و پرند بیدار ہو کر اپنی ضروریات
کی طرف متوجہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور سحر خیز لوا جو ابھی تھوڑی دیر قبل خاموش تھا
شعر خوانی اور گیت گانا شروع کرتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ یہ تینوں ٹکڑے جو میں نے اس مقام پر نقل کئے ہیں انگریزی شاعری
کا ایک بہت عمدہ نمونہ ہیں۔ اور فی الحقیقت قابل تعریف ہیں۔ مگر ملٹن کے قاعدۂ
کلیہ سے انکو پرکھو تو پہلے میں نازک خیالی ہے عبارت صاف نہیں۔ دوسرے اور

تیسرے میں سادگی ہے نازک خیالی کا پتہ نہیں اور مضمون پر غور کرو تو باستثنائے شیکسپیر کے کسی کے طرز بیان میں حلاوت نہیں۔ اب میں ایک مشرقی شاعر کے چند بند صبح کی تعریف میں لکھتا ہوں جو نیچر کی سچی تصویر ہیں جنمیں نازک خیالیاں بدرجہ کمال ہیں جنکا اثر بھی آسانی سے زائل نہیں ہوسکتا۔ اور جنکی عبارت سلیس اور طرز بیان دلکش ہے (انیس)

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح — سرگرم ذکر حق ہوئی طاعتگذار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دم بدم — مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد — مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد — یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

تھا بسکہ روز فتح شہ آسماں جناب — نکلا تھا خوں کی ہوکے چہرے سے یہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

یہ تو صبح کی دلفریب تصویر تھی اب رات کا تماشا ملاحظہ ہو۔

شیکسپیئر رات کا مؤثر سین یوں کھینچتا ہے۔

Look, the world's comforter with weary gait,
His day's hot task has ended in the west,
The owl, night's herald, shrieks, 'tis very late
Sheep are gone to fold, birds to their nest;
And cool-black clouds that shaddow heaven's light
Do summer us to part, and good night.

آفتاب نے جو دنیا کا تسلی دینے والا ہے اپنی روزانہ مسافت تمام کی۔ الو چلا رہا ہے رات زیادہ آگئی۔ وحوش و طیور اپنی اپنی آرام گاہوں کی طرف رخصت ہوئے۔ اور سیاہ بادل جو آسمانی نور کو چھپائے ہوئے ہیں ہم کو الوداع کہنے کا حکم دیتے ہیں۔

اٹیدور ڈینگ رات کی تاریکی یوں دکھاتا ہے۔

Night, sable goddess! from her ebon throne
In rayless majesty, now stretches forth
Her leaden sceptre o'er a slumbering world
Silence, how deep! and darkness how profound!
Nor no listening ear an object finds;
Creation sleeps.

رات! کالی دیبی!!! اپنے آبنوس کے تخت سے بڑی شوکت و دبدبہ کے ساتھ تمام سوتی ہوئی دنیا پر اپنے سیاہ عصا رشاہی کا سایہ ڈالتی ہے۔ کیا سنسان خموشی ہے اور کیسی گہری تاریکی ہے۔ اس وقت کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تمام مخلوق سو رہی ہے۔

غور سے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ پہلی نظم میں نازک خیالی نہیں اور دوسری میں اس قدر بلند پروازی ہے کہ سادگی کی حد سے متجاوز ہو گئی۔

البتہ ہمارا مشرقی شاعر یہی سین اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ مذکورۂ بالا تینوں اوصاف اُس میں جمع ہیں۔ (انیس)

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی

فریاد کناں روحِ امیرِ عرب آئی
غل تھا کہ شبِ قتل شہِ تشنہ لب آئی

سادات کو کیا کیا غمِ جانکاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اُس شب کی سیاہی
ہے چار طرف جس کی سیاہی سی تباہی

مرغانِ ہوا بر میں تپاں بحر میں ماہی
تربت سے نکل آئے تھے محبوبِ الٰہی

فریاد کا تھا شور رسولانِ سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اُداسی تھی نجف میں

تھی طرفہ شبِ تار کہ تارے بھی تھے مستور
اک پارہ ہے جس کا شبِ یلدا شبِ دیجور

دوڑے کہیں شبدیز نظر کا تھا نہ مقدور
ہوتا نہ تھا ثابت کوئی نزدیک ہے یا دور

حضرت پہ وہ اُس تیز، پہر رات میں گذری
تکلیف سکندر پہ جو ظلمات میں گذری

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں

دھڑکا تھا کہ دہشت سے نجانیں کہیں جائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں

گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشۂ والا
آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا وہ بالا

مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اُجالا　　خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اڑتی تھی مُنہ پر حرم شیر خدا کے
تھا چیں پہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

اس وقت ایڈورڈ ینگ کے چند اشعار یاد آئے جن میں یہ تینوں خوبیاں نہایت عمدگی سے جمع ہوگئی ہیں۔ چونکہ ان کا چھپانا انصاف کے خلاف تھا اس لئے وہ بھی لکھے دیتا ہوں۔

Tired natures sweet restorer, balmy sleep!
He, like the world, his ready visit pays
Where fortune smiles the wretched he forsakes
Swift on his downy pinion flies from woe,
And lights on lids unsullied with a tear
From short (as usual) and disturbed respose,
I wake = how happy they who wake no more,
Yet that even vain, if dreams infest the grave.

اے تھکی ہوئی طبیعت کو تر و تازہ کرنے والی نیند! تو بھی دنیا والوں کی طرح انہیں سے ملتی ہے جو خوش حال ہوں اور بدنصیبوں کو فراموش کرتی ہے۔ تو رنج و غم کے پاس نہیں بھٹکتی اور اُن آنکھوں میں جاتی ہے جو آنسوؤں سے بیداغ ہوں۔ میں آج بھی حسب معمول نہایت مختصر اور پریشان نیند کے بعد چونک پڑا۔ وہ لوگ کیسے خوش قسمت ہیں جو ایسی میٹھی نیند سوئے کہ کبھی نہ چونکیں گے مگر جو پریشان خواب قبر میں بھی ستاتے ہوں تو یہ آرزو بھی فضول ہے۔"

ہمارے ملک کے بھی ایک شاعر نے "نیند" پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

وہ بھی ملاحظہ ہوں ؎

وصل میں رفتارِ معشوقانہ دکھلاتی ہے نیند
آج کن اٹکھیلیوں سے آنکھ نہیں آتی ہے نیند

فرقتِ دلدار میں سہواً اگر آتی ہے نیند
آنکھ سے باہر ہی باہر آکے پھر جاتی ہے نیند

کروٹیں لیلے کی کہتے ہیں شبِ فرقت میں ہم
کس طرح اے خفتگانِ خاک آجاتی ہے نیند

نیند کو بھی نیند آجاتی ہے ہجرِ یار میں
چھوڑ کر محجوب مجھ کو آپ سو جاتی ہے نیند

فرقتِ دلدار میں جو رات بھر آئی نہ تھی
وصل میں آتے ہوئے آنکھوں نہیں شرماتی ہے نیند

منتظر رکھتی ہے غمزے کرتی ہے آتی نہیں
ادبِ ترساتری فرقت میں ترساتی ہے نیند

گرمیٔ سوزِ جگر بیتاب کر دیتی ہے جب
ٹھنڈی سانسیں ایسی بھرتا ہوں کہ آجاتی ہے نیند

واہ رے تاثیرِ الفت بل بے فرطِ اتحاد
غش پہ غش آتے ہیں مجھ کو جب نہیں آتی ہے نیند

ہجر میں سونے کی ایسی ہے تمنا اے وزیر
دیکھتا ہوں اُس کو حسرت سے جسے آتی ہے نیند

جب یہ ثابت ہوگیا کہ شیلی نے نظم کا جو موضوع سمجھا ہے اور ملٹن نے اعلیٰ شاعری کے لئے جو اجتماع ثلثہ ضروری قرار دیا ہے اُس کا نمونہ ہمارے ملک کی نظموں میں موجود ہے اور نہایت خوبی لطافت و نزاکت سے ہے تو اُس نئی نسل کو جو انگلستان کے کے ہر دانشمند کا قول "کالوحی من السماء" سمجھتی ہے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو زبان کی مظلوم شاعری میں وہ کل جوہر کافی طور پر موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجہ کی نظم میں ہونا چاہئیں اور باعتبار بلندی خیالات، صفائی بیان، صدق جذبات، خوبی بندش اور عجیب و غریب تاثیر کے وہ بھی اس قابل ہے کہ اُس کو یورپ کی اعلیٰ سے اعلیٰ شاعری کے برابر جگہ دی جائے، ہم یہ پیشتر ہی کہہ چکے ہیں کہ ہماری شاعری میں جو چند فحش اور غیر مہذب الفاظ ہیں وہ زمانہ کے اثر ہیں اور انگلستان کے مرخرفات سے بدرجہا غنیمت ہیں بلکہ پہاڑ کے نیچے آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہیں اسلئے یہ بھی ضرور

ماننا ہوگا کہ انگریزی شاعری سراسر مہذب اور شائستہ ہے تو ہماری نظمیں اُن سے بھی زیادہ عمدہ اخلاق کی تعلیم دیتی ہیں اور ہمارے شعرا نے جو کچھ رطب و یابس کہا ہے وہ تقریباً نیچرل جذبات و کیفیات کی تصویر اور فلسفہ کے دقیق مسئلوں کا لب لباب ہے۔

اب معرض بحث میں صرف یہ امر رہ گیا کہ ہماری شاعری میں اصناف سخن میں سے بعض کی طرف خاص توجہ کی گئی بعض کی طرف کم التفات کیا گیا اور بعض بالکل ترک کر دیئے گئے مثلاً غزلوں اور قصائد میں بڑی بلند پروازی دکھائی۔ رباعیات اور قطعات کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی اور ڈراما ایک بھی نہ لکھا۔

یہ ایک بالکل فرعی بحث ہے اور اسکے لئے صرف یہی جواب کافی ہے کہ ہمارے شعرا جو سوسائٹی کا عام مذاق سمجھتے تھے اور جس روش کو عام پسند خیال کرتے تھے اُسی پر زور قلم دکھاتے تھے۔ یا یوں کہو کہ جو سکہ بازار میں چلتا تھا اُسی کو جیب میں ڈال کر گھر سے نکلتے تھے۔ اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ نخاس پہنچتے پہنچتے زمانہ کی ہوا پلٹ جائیگی اور شاہ عالم کے درباریوں اور رنگیلے پیا جانِ عالم کے مصاحبوں سے شاہ ایڈورڈ ہفتم کا چہرہ دار روپیہ طلب کیا جائیگا۔

اس کو خواہ اُردو شاعری کی بدقسمتی سمجھو یا شعرا کے عالم الغیب نہونیکا قابل افسوس نتیجہ خیال کرو کہ ہمارے شعرا نے اپنی نازک خیالیاں زیادہ تر غزلوں کی صورت میں ظاہر کیں اور مسلسل نظموں کی طرف متوجہ نہ ہوئے جو آج اُنیسویں صدی میں اُنکے کلام کی قدر کی جاتی لیکن یہ تو بتاؤ کہ ایک واقعہ کا مختصراً چند الفاظ میں بیان کر دینا اچھا ہے یا صرف طول سخن کے لئے اسی ایک مضمون کو عبارت کے پیچدار سلسلہ میں پھنسا کر صفحے کے صفحے سیاہ کر جانا؟

چونکہ ہماری غزلوں کا ہر شعر عموماً ایک نیا مضمون اور نیا واقعہ بیان کرتا ہے اسلئے

شاعر کو مجبوراً اپنی نازک خیالی مختصر الفاظ میں ظاہر کرنا ہوتی ہے تاکہ شعر کی محدود بحر میں وہ کل مفہوم صاف طور پر ادا ہو جائے جو اُس وقت بیان کرنا مقصود ہے۔

انصاف کا خون ہے کہ اگر ایک مضمون پچاس شعروں میں ختم ہوتا تو اُس کی تعریف کرتے مگر چونکہ ایک ہی شعر میں بیان کر دیا ہے اس لئے داد نہ دیں گے!!

اگر معشوق کی تعریف میں سر والٹر اسکاٹ کی طرح کئی صفحہ سیاہ کرتے تو بڑی خوبی تھی اور اگر ایک ہی شعر میں کہہ دیا کہ"

حسن بھی مہر و وفا بھی ہے مروت بھی ہے ناز بھی غمزہ بھی شوخی بھی شرارت بھی ہے

تو ایسا سخت گناہ کیا کہ جو ہرگز قابل معافی نہیں!!!

اساتذہ کے دواوین دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اُنکا ہر ایک شعر یا تو کسی طول طویل واقعہ کا خلاصہ ہے یا کسی جوش و خروش کی مختصر روئداد ہے یا کسی جذبۂ انسانی کے چھوٹے پیمانہ کی تصویر ہے یا کسی اخلاقی مسئلہ کا حاصل مطلب ہے۔ غرض چند الفاظ میں اُن تمام کیفیات۔ جذبات، خیالات اور واقعات کا خلاصہ ہے جن پر شیکسپیر اور بائرن کو جداگانہ مستقل کتابیں تصنیف کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی ہے۔

مگر زمانہ کا رنگ کوئی بدل نہیں سکتا۔ غزلوں کی طرف سے ایک عام بے توجہی جو اس زمانہ میں پیدا ہو گئی ہے اُس کا دفعہ ہونا مشکل ہے اور نئی نسل نے (جو اس رمز سے آگاہ نہیں کہ غزل صرف مشق سخن بڑھانے اور طبیعت میں تیزی پیدا کرنیکے لئے ہے) اس کے متعلق جو نفرت و حقارت کے خیالات اپنے دل میں جمع کر لئے ہیں اُن کا مٹانا دشوار ہے۔

غزل پر کیا موقوف ہے یہ کل مشرقی علوم و فنون کی ناقدری کا عہد ہے اس مقدس صدی میں غزل کی طرف سے جب ایک بار نظر اٹھالی تو وہ پھر جا ہے کیسی ہی خوشنما اور آبدار موتیوں کی لڑی ہو لیکن ناشناس کھرل میں پیس کر مانیں گے۔ لہذا میں بھی اس صنف

سخن کو چھوڑ کر اُس بیش بہا گنجینہ کی طرف رُخ کرتا ہوں جس پر اُردو شاعری کو اپنے عروج و کمال کے زمانہ میں تو چنداں نازنہ تھا مگر بیسویں صدی میں اُسی پر فخر کرنا بجا و درست ہے۔

اس انمول خزانہ سے میری مراد مثنویاں اور مراثی ہیں جن میں سے ایک چند مراتب میں انگلستان کے ڈراموں سے افضل ہے اور دوسرا یورپ کے ایپک پوئم (Epic Poem) کا جواب ہے۔

اصطلاح شعرا میں ڈراما اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شاعر فاعل کو حاضر فرض کر کے اُس کے اقوال نقل کر دیتا ہے اور افعال سے کچھ بحث نہیں رکھتا۔

ہماری مثنویوں میں یہ لطف ہے کہ ہم ڈرامے کی طرح اقوال کا چربہ اُتارتے ہیں اور ساتھ ساتھ افعال کی بھی جھلک دکھاتے جاتے ہیں یعنی وہ سخت اور دشوار کام جو شاعر ڈرامے میں ایکٹر کے لئے چھوڑ دیتا ہے جس کو اصطلاح ناٹک میں لفظ موشن (Motion) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جس پر ڈرامے کی عمدگی و خرابی یہاں تک منحصر ہوتی ہے کہ اگر کوئی ناتجربہ کار یا بدسلیقہ ایکٹر کسی ایک پارٹ کو خراب کر دے تو تمام تماشے کا لطف بگڑ جاتا ہے۔ ہماری مثنویوں میں شاعر خود ہی دکھا دیتے ہیں۔

مشہور ہے کہ لندن میں ایک بار آتھیلو کی بی بی ڈیسڈیمونا کا پارٹ آئرلینڈ کی ایک نووارد ایکٹریس نے کیا تھا تو ہیروین کے دردناک انجام پر حاضرین جلسہ بجائے غم کے آنسو بہانے کے اس قدر ہنسے تھے کہ آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور انگلستان کے مشہور ٹریجک ایکٹریس (Tragic Actress) مسز سڈنس (Mrs. Siddons) نے ایکبار اسٹیج پر اپنا کمال دکھانے کے لئے چند مضحک پارٹ ایسی سنجیدگی اور متانت سے کئے تھے کہ ہنسی میں غم کا پہلو نکل آیا۔

غرض یہ ایک مسلم واقعہ ہے کہ خواہ کیسی ہی دردناک نظم اور کیسا ہی حسرت خیز سین ہو

لیکن جب تک ایکٹر کو پارٹ کرنے کا سلیقہ نہو گا تماشہ کا رنگ نہ جمے گا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ ڈراما جسم ہے اور موشن روح۔ اگر روح لطیف ہے تو جسم کیسا ہی بدنما ہو عزت حاصل کریگا اور اگر وہ کثیف ہے تو جسم کیسا ہی حسین اور خوشنما ہو مگر حقارت اور نفرت عام سے اُس کا استقبال کیا جائیگا۔

جو ظالم اُردو شاعری میں ڈراما نہونے کا داغ ایک قومی ذلت اور ملکی نقصان سمجھتے ہیں ذرا دل میں غور کریں کہ مردہ جسم چورا ہے پر کتوں کے سامنے پھینک دینا اچھا ہے۔ یا قالب انسانی تیار کر کے اُس میں روح پھونکنا اور دنیا کے کاروبار میں اُس سے کام لینا!!

اگر موخرالذکر صفت افضل ہے تو اُس کی تعریف کی مصداق ہمارے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی مثنویوں میں عالی دماغی سے ایک نئی دنیا قایم کی ہے اور اُسکے باشندوں کو ہمارے سامنے چلتا پھرتا دیکھا دیا۔ ہماری مثنویاں ڈرامے کی طرح ایکٹروں کی موشن کی محتاج نہیں ہیں بلکہ تم کتاب اٹھاؤ اور کسی جگہ سے پڑھنا شروع کرو۔ عالم خیال میں آنکھوں کے سامنے تھیٹر سے زیادہ دلکش تماشہ ہونے لگے گا جس میں تم ایکٹروں کی آواز سنو گے اور اُن کی حرکات و سکنات پر بھی غور کرتے جاؤ گے۔

المختصر بہت آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے شعرا نے مثنویوں میں ڈرامے کی کل خوبیاں جمع کر دی ہیں بلکہ ایکٹروں کے موشن دکھانا جو ایک مرقع نگار کا فرض نہیں وہ بھی اُنھوں نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ ہمارے شعرا نے مثنویوں میں مسئلہ تثلیث الوحدت کا التزام نہیں رکھا جسکے بغیر سفاکلیز کی نظر میں کوئی ڈراما قابل وقعت نہیں ہو سکتا مثنویوں کی لئے ضروری نہیں سمجھا لیکن جب شیکسپیئر جس کو اس صنف سخن کا خداوند کہنا درست ہے اس تثلیث کی ہمیشہ پابندی نہ کر سکا اور بائرن کے سے نازک خیال اور عالی دماغ بادشاہِ سخن نے مجبور ہو کر اس تثلیث سے منہ موڑا تو یہ خیال بھی بالکل بیجا ہے کہ اُردو مثنویاں

ڈراموں کی ہم پلہ اس وجہ سے نہیں ہوسکتیں کہ اُن میں تثلیث الوحدت کا التزام نہیں بیشک وحدت مضمون ہر قصہ کے لئے ضروری ہے اور یورپ کے قریب قریب کل ڈراموں میں اب قدیم یونانی مرقع نگاروں کی یاد دلانے والی صرف یہی ایک وحدت ہے جس کا ہمیشہ لحاظ رکھا جاتا ہے کیونکہ اگر ایک ہی واقعہ کی نقل کرنے میں دو متضاد روایتیں جمع کردی جائیں تو بمصداق دروغ گو را حافظہ نباشد جھوٹ فوراً ظاہر ہوجاتا ہے (حالانکہ خدا کے فضل سے یورپ کے شاعروں اور قصہ نویسوں کو جھوٹ بولنے میں چشم بد دور وہ ملکہ حاصل ہے کہ بڑی بڑی ضخیم جلدیں سیاہ کرجائیں اور نکتہ چیں کسی جگہ سے ایسی خطا دریافت نہ کرسکے جو اُس کے سچ ہونے میں شک ڈال دے) ہمارے ہندوستانی شاعر گو یورپ والوں کے سے سیاہ اور گہرے جھوٹ نہیں بول سکتے لیکن اس وحدت کا انہوں نے بھی حتی الامکان خیال رکھا ہے اور ہماری مثنویوں میں بھی کوئی دو ایسی متضاد روایتیں جنکی تطبیق کسی طرح بھی نہو سکے تلاش کرلینا آسان نہیں ہے۔

ڈرامے کی ضروریات میں سے یورپ کے سخن شناسوں نے سرعت بیان موثر طرز گفت گو اور نیچرل انداز تقریر کو بھی قرار دیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ اوصاف بھی ہماری مثنویوں میں موجود ہیں اور ان کل خوبیوں کی مثالیں تم کو اُن اشعار سے مل سکتی ہیں جو مثنویات میر حسن، گلزار نسیم، طلسم الفت وغیرہ میں موجود ہیں۔

اُردو شاعری پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُس میں کوئی ایپک پویم نہیں لیکن میں کہتا ہوں اور ثابت کرسکتا ہوں کہ یورپ کے شعرا ایپک کے لئے جو اوصاف ضروری سمجھتے ہیں وہ باستثنائے ایک کے سب ہمارے دردناک مرثیوں میں موجود ہیں۔ وہ اوصاف کیا ہیں جو ایپک میں ہونے چاہئیں اور ہمارے مرثیوں میں بھی موجود ہیں میں ابھی نہ بتاؤں گا۔ وہ کون وصف ہے جو ایپک کے لئے ضروری ہے اور ہمارے مرثیوں میں نہیں ہے؟ ایک مسلسل مطول طویل قصہ!! اس ضروریات کے پورا کرنے کے لئے

میں نے کمر ہمت باندھی ہے اور فی الحال کلیات میر انیس سے بند انتخاب کر کر کے ایک مسلسل مرثیہ جس میں میدانِ کربلا کا پورا حسرت خیز اور عبرت انگیز دردناک واقعہ ہو اور جو "روانگی قافلۂ اہل بیت از مدینہ" سے شروع ہو اور واپسی حرم پر تمام کر دیا جائے تیار کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ وہ مرقع جلد سج کر پبلک کے سامنے پیش ہو اور اردو شاعری کے دلفریب چہرہ سے یہ بدنما داغ مٹ جائے کہ اس میں کوئی ایپک پویم نہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

غرض اردو شاعری کی حقارت اس وجہ سے کرنا کہ اس میں وہ اصناف موجود نہیں جن کی تمہاری نظر میں آج کل وقعت ہے بالکل بیجا اور بڑی ہٹ دھرمی ہے جب ثابت ہو گیا کہ شاعری کے اصلی اور سچے جوہر تمہاری قومی زبان کی نظموں میں موجود ہیں تو اگر ڈراما اس میں نہ ہوا تو کیا نقصان اور ایپک اس میں موجود نہیں تو کیا ہرج؟ میری نظر میں تو تمہارے اس اعتراض کی اس وقت وقعت ہوتی کہ بجائے الزام دینے اور مزا کہنے کے تم خود کچھ کر کے دکھاتے۔

اور اگر ڈراما تمہاری زبان میں موجود نہ تھا تو خود لکھ کر پیش کرتے اور دوسروں کو سبق پڑھاتے کہ ڈرامایوں لکھتے ہیں۔

خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اگر تم میں غیرت و حمیت کا مادہ ہو تو ہمیں میدان، ہمیں چوگان، ہمیں گوے۔ شاعری کے اسٹیج پر قدم رکھو اردو نظم کی ترقی کے لئے کوئی عملی کارروائی کرو۔ پھر تمہارے ہر اعتراض کو ہم جان و دل سے سنیں گے اور تمہاری ہر نکتہ چینی کو نیک نیتی پر محمول کریں گے۔

بقلم

محمد امیر احمد علوی

بی۔اے۔ لکھنؤ

عربی زبان میں مرثیہ کس شان سے کہا گیا

دنیا میں جب سے شاعری کا پتہ ملتا ہے اُسی وقت سے شاعری میں ہر قوم کے شادی و غم کے واقعات کا سراغ چلتا ہے پھر شاعری کے اخلاق و ادب کو مختلف صورتوں پر تقسیم کیا گیا ہے معشوق سے باتیں کرنے کو غزل بنائی گئی بادشاہوں کی تعریف کو قصاید کی ایجاد ہوئی۔ زندوں کی تعریف کو تقریظ سے مخصوص کیا گیا مردوں کی تعریف مرثیہ و نوحہ سے منسوب ہوئی۔ عرب کی شاعری میں اصناف شاعری کو برتا جاتا تھا اور ہر ایک کے ادب کی شان خاص تھی۔ اکثر عورتیں اپنے قبیلہ کے کسی بہادر یا مشہور شخص کے مرنے پر اُس کا نام لے کر بین کرتیں اور اُس کے مشہور واقعات کو نظم میں ادا کرتی تھیں۔ شعرا عرب بھی اکثر مشہور فیاضوں اور بہادروں کے حالات مرثیت کی شان میں لکھتے تھے۔ ایام جاہلیت کے اکثر مرثئے ادب کی کتابوں میں یادگار ہیں اور مسلمانوں نے بھی اس سے خاص دلچسپی ظاہر کی ہے چنانچہ قبیلۂ قریش میں حضرت رسالت پناہی کے خاندان میں شاعری اور ادب کا چرچا تھا جس کی فصاحتیں تمام عرب میں بطور نمونہ تسلیم کی جاتی تھیں۔

حضرت مطّلب نے اپنی پانچ بیٹیوں سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے جیتے جی میرے مرثئے کہو تاکہ میں اپنی نسبت ہر اک خیال سے واقف ہو جاؤں اور مرنے کے بعد کے خیالات اپنی زندگی میں سُن لوں۔ چنانچہ آپ کی پانچوں بیٹیوں نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور پانچوں نے مرثئے لکھے۔ یہ مرثئے خواتین اسلام کے تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اُردو خوانوں کو عربی مرثیوں کو زیادہ مذاق نہیں اس لئے میں اُن کے نقل کرنے سے قلم کو روکتا ہوں۔ عرب کی شاعری

میں مرثیہ کا مفہوم چند اشعار میں ادا ہو جاتا ہے اس لئے اکثر مرثئے دس دس پندرہ پندرہ بیس بیس شعر سے زیادہ نہیں اور نہ اس قسم کی شاعری میں بتدریج کوئی جدت نظر آتی ہے بلکہ جو حالت تیرہ سو برس سے پہلے تھی وہی اب بھی قایم ہے شعرائے عرب نے اُس میں کوئی خاص ترقی ظاہر نہیں کی۔

اب میں آپ کے سامنے عربی کا ایک ایسا مرثیہ پیش کرتا ہوں جو جناب مفتی میر عباس صاحب مرحوم اخباری کانپوری کی تصنیف ہے۔ مفتی صاحب کا ادب ہندوستان سے حجاز تک مسلم ہے اور وہ خود بھی میر انیس اور مرزا دبیر کے ہمعصر اور ان دونوں بزرگوں کی ترقیات کلام کو دیکھ چکے تھے۔

اور فارسی میں بھی مرثیت کے لئے کوئی خاص وضع اختیار نہیں کی گئی بلکہ قصہ و مثنوی میں جب بہ سبیل تذکرہ کسی برگزیدہ شخص کی رحلت سے افسوس کا اظہار مقصود ہوا تو اس کو چند شعروں میں ادا کر دیا گیا جیسا کہ فردوسی نے شاہنامہ میں سہراب اور رستم کی موت پر نوحہ خوانی کی ہے اور ایران کے شیعہ مسلمانوں نے بھی سبط شہید کے مراثی اور سلام اور نوحوں کو بطور غزل یا قطعہ یا مثنوی و مسترزاد کے تھوڑے تھوڑے اشعار میں لکھ کر اپنے جذبات کو ختم کر دیا ہے پس عربی کی طرح فارسی میں بھی مرثیہ کہنے کے لئے کوئی خاص وضع اختیار نہیں کی گئی۔ مگر اُردو میں جناب خلیق و ضمیر نے مرثیہ کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی ابتدا کی۔ اور میر انیس اور میرزا دبیر نے اُس قالب میں وہ وسعتیں پیدا کیں جو عربی اور فارسی دونوں کے حصہ میں نہیں آئیں اور جس سے اُردو میں ایک قابل قدر اور لائق فخر ذخیرہ فراہم ہو گیا جو شمعیں عربی اور فارسی کے عالی شان ایوانوں میں فانوسوں کے اندر روشن ہوتی تھیں اُن کو میر انیس اور میرزا دبیر نے جھاڑ کی صورت میں روشن کر کے اُس کی نور فشاں روشنیوں سے بزم عالم کو روشن کر دیا اور اُردو کا دیوانخانہ

اس روشنی سے جگمگانے لگا۔

تیرہ سو برس کی شاعری میں جو انقلابات ہوئے اُن کی تصویریں مفتی صاحب کے دل پر اُتری ہوئی تھیں۔ اس لئے اُن کا مرثیہ ایک مکمل نمونہ خیال کیا جانا چاہیے۔ اُنھوں نے عربی میں جو مرثیہ لکھا اُس کو مع اعراب اور ترجمہ کے نقل کرتا ہوں کہ اُردو خواں آسانی سے اُس کا مطالعہ کرسکیں اور اُن کی نگاہ میں عربی شان مرثیت کا ایک مقدار معین ہوجائے جس کے مقابلہ میں وہ اُردو کو دیکھ سکیں۔

مرثیہ عربی

تصنیف مفتی میر محمد عباس صاحب شوستری مرحوم

أَتَى شَهْرٌ بُكَاءُ الدُّمُوعِ مُحَرَّمٌ
وَشَهْرٌ لَذِيذُ الْعَيْشِ فِيهِ مُحَرَّمٌ

مہینہ آنسو بہانے کا یعنی محرم آپہنچا
وہ مہینہ جس میں تمتع کیواسطے عیش لذیذ حرام ہوگیا ہے

تَنَعَّمَ فِيهِ آلُ مَرْوَانَ فَرْحَةً
وَآلُ رَسُولِ اللهِ لَمْ يَتَنَعَّمُوا

اس مہینہ میں آل مروان نے خوشی کرکے راحت پائی
اور آل رسالتمآب نے راحت نہ پائی بلکہ مبتلا و مصائب ہوئے

لِآلِ أَبِي سُفْيَانَ دُورٌ مُسَرَّةٌ
وَفِي بَيْتِ أَهْلِ الْبَيْتِ قَدْ قَامَ مَاتَمٌ

آل ابوسفیان کے گھر خوشی سے بھرے ہیں
اور خانۂ عصمت سرائے اہل بیت میں ماتم برپا ہے

وَسِبْطُ رَسُولِ اللهِ يَبْكِي تَغُرُّهُ
وَأَوْلَادُ حَرْبٍ تَغْرُهُمْ تَتَبَسَّمُ

اور سبط رسول جگر گوشہ بتول کو دندان مبارک کے ساتھ زخمی کیا جاتا ہے
اور اولاد حرب کے لب دندان تبسم کرتے ہیں

لَقَدْ قَامَ فِي آلِ النَّبِيِّ قِيَامَةٌ
وَعِنْدَ أَهَالِي الشَّامِ عِيدٌ وَمَوْسِمٌ

اہل بیت رسول مختار میں تو قیامت برپا ہے
اور اہل شام کے یاں جشن عید ہے اجتماع ہے

أَهُمْ جَهِلُوا مَجْدَ الْحُسَيْنِ وَأَنْكَرُوا ... وَقَدْ عَرَفُوا جَدَّ الْحُسَيْنِ وَأَسْلَمُوا

کیا وہ لوگ حسینؑ مظلوم کی بزرگی سے ناواقف تھے ... حالانکہ انہوں نے حسینؑ کے نانا کو خوب پہچانا اور اسلام بھی لائے

فَتَعْسًا لِقَوْمٍ جَدَّلُوهُ عَلَى الْفَلَا ... وَقَوْمٍ عَلَى شَطِّ الْفُرَاتِ تَزَاحَمُوا

پس ہلاکت ہو اس قوم کو جنہوں نے اس امام ہمام کو دشت کربلا پر شہید کر کے ڈالدیا اور اس قوم پر جنہوں نے کنارۂ فرات پر پانی بند کر دیا

نَوَاهَا الْكُتُبُ ضَمَّنُوهَا دُعَاوُهُ ... لِيَأْتِيَهُمْ مُبْتَشِرًا بِهُدَاهُمْ

افسوس اُن خطوں پر جنہیں طلب اُن بیچاروں نے تحریر کی تھی ... تاکہ حضرت اُن لوگوں کی ہدایت سے مسرور ہو کر تشریف لائیں

فَوَافَوْا فَدَحَكَتْ الْفَهْمُ بِهِ ... وَنُصْرَتَهُ مِنْهُمْ كُلٌّ أَوْهَمُوا

ہزاروں خطوں کی نوبت پہنچ گئی کہ وہ خطوط خبر دیتے تھے کہ یہ لوگ حضرتؑ سے محبت رکھتے ہیں اور نصرت کرینگے اور یہ امر موہوم تھا

فَوَلَّى عَلَيْهِمْ مُسْلِمَ بْنَ عَمِّهِ ... لِيُخْبِرَهُ عَنْ سُخْطِهِمْ وَرِضَاهُمُ

پس حضرتؑ نے اپنے چچا زاد عم مسلم ابن عقیل کو حاکم کر کے ان لوگوں کے پاس بھیجا تاکہ حضرت کو خبر پہنچائیں اُن لوگوں کی رضا اور خوشنودی سے

فَلَمَّا دَنَى مِنْهُمْ أَتَوْهُ تَوَدُّدًا ... وَبَايَعَهُ أَعْيَانُهُمْ وَتَرَاكَمُوا

پس جبکہ حضرت مسلم ان لوگوں کے قریب پہونچے کمال اظہار دوستی وہ سب حاضر ہوئے اور اُنکے سرداروں نے مل کے بیعت کی

فَمَا لَبِثُوا أَنْ كَانَ لِلْأَمْرِ بَعْدَ ذَا ... مِنَ ابْنِ زِيَادٍ شِدَّةٌ وَتَفَاقُمُ

پس کچھ زمانہ نہ گزرا تھا کہ بعد اس بیعت کے ... ابن زیاد کی طرف سے شدت اور سختی ہوئی

وَهُمْ قَلَبُوا ظَهْرَ الْمِجَنِّ لِمُسْلِمٍ ... فَأَضْحَى وَحِيدًا فِي الرِّفَاقِ يُزَاحِمُ

اُن بیوفاؤں نے حضرت مسلم سے بیعت شکنی کی اور رنگ بدل دیا پس حضرت مسلم تنہا رہگئے کہ لوگوں نے کوچہ میں گھیر لیا

لَقَدْ نَكَثُوا عَهْدَ النَّبِيِّ وَخَالَفُوا ... وَعَهْدَ يَزِيدٍ أَبْرَمُوهُ وَأَحْكَمُوا

اُن لوگوں نے رسول خدا کی بیعت کو توڑ ڈالا اور مخالفت کی اور یزید پلید کے عہد کو خوب مضبوط و استوار کیا

بِنَفْسِيَ إِذْ حَفُّوا بِهِ وَهُوَ قَائِمٌ ... يُقَاتِلُ مَنْ أَعْلَى الْبِنَاءَ وَيُرْجَمُ

میرا جان میری اُس پر نثار ہو کہ جب اُس کو گھیر لیا تھا اور وہ کوٹھے پر کھڑے تھے اور وہ لوگ لڑتے تھے اور پتھر پھینکتے تھے اور زخم لگاتے تھے

فَكَادَ لِيُرْدِيهِمْ فَكَادُوا مَكِيدَةً ۔۔۔ اَلَا مَانِ فَارْدُوهُ وَقَالُوا اسْتَعْصَمُ

قریب تھا کہ حضرت مسلم ان سب کو ہلاک کریں کہ اُن مکاروں نے امان کا حیلہ کیا اور کہا کہ تم سے اب جنگ نہ ہوگی

فَيَا هَفَ اِذْ اَمَّ ابْنُ حِمْرَانَ قَتْلَهُ ۔۔۔ وَذَا صَابِرٌ مُسْتَغْفِرٌ وَمُعَظِّمُ

مقام افسوس ہے کہ ابن حمران نے قتل مسلم کا ارادہ کیا اور وہ جناب صابر تھے اور استغفار کرتے تھے

وَيَا هَفَ اِذْ اَوْصَى ابْنُ سَعْدٍ بِرَدِّهِ ۔۔۔ حُسَيْنًا وَمَنْ اَوْصَاهُ لَمْ يَكُ يُرْحَمُ

مقام افسوس ہے جبکہ وصیت کی اُس بزرگوار نے ابن سعد سے کہ امام حسین کو آنے سے روکدو مگر ایسے شخص نے وصیت کی جو رحم نہ کرتا تھا

وَقَدْ خَرَجَ الْمَوْلَى الْحُسَيْنُ مُصَادِفًا ۔۔۔ لَهُمْ جَرَى هٰذَا وَمَا كَانَ يَعْلَمُ

اور اتفاق یہ ہوا کہ امام حسین نے بھی اسی تاریخ مکہ سے سفر کیا جس روز یہ واقعہ کوفہ میں ہوا مگر حضرت کو خبر نہ تھی

وَلَاقَاهُ نَاسٌ بَعْدَ نَاسٍ وَاَخْبَرُوْ ۔۔۔ بِاَنَّكَ مِنْ كَيْدٍ لِاَعْدَائِكَ تَسْلَمُ

اور اُن جناب سے یکے بعد دیگرے لوگوں نے ملاقات کی اور خبر دی کہ آپ سفر میں دشمنوں کے مکر سے سلامت نہ رہیں گے

فَقَالَ نَعَمْ اِنِّيْ لَاَعْرِفُ مَصْرَعِيْ ۔۔۔ وَمَصْرَعَ اَصْحَابِيْ وَاِنِّيْ لَاَعْلَمُ

حضرت نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں اپنے اور اپنے اصحاب کے قتل گاہ کو اور خوب واقف ہوں

وَلٰكِنْ جَدِّيْ بِالرَّحِيْلِ اَشَارَنِيْ ۔۔۔ وَاِنِّيْ لِمَا مَضٍ فِيْهِ عَزْمِيْ مُصَمِّمُ

لیکن میرے نانا رسول خدا نے مجھ سے کوچ کا اشارہ کیا ہے اور میں ضرور جاؤں گا میرا عزم اس بارہ میں مصمم ہے

فَلَمَّا اَنَاخَ الرَّحْلَ قُرْبَ زُبَالَةٍ ۔۔۔ اَتَى رَجُلٌ نَعِيْ بِاَنْ مَاتَ مُسْلِمُ

پس جبکہ حضرت نے قریب منزل زبالہ کے اقامت فرمائی وہاں ایک شخص نے حاضر ہو کر خبر قتل مسلم پہنچائی

فَرَقَّ لَهُ مُسْتَرْجِعًا ثُمَّ اَخْبَرَ النِّسَا ۔۔۔ فَاَقَامَتْ فِي الْخِيَامِ مَاتِمُ

حضرت نے یہ خبر سُنکر انا للہ کہا اور غمگین ہوئے پھر اہل حرم کو خبر کی پس خیموں میں حضرت مسلم کا ماتم برپا ہوا

فَوَدَّعَهُ اَهْلُ الْمَطَامِعِ وَالْهَوٰى ۔۔۔ وَاَسْعَدَ مَنْ بِالسَّعَادَةِ كُرِّمُوا

سنتے ہی اس خبر کے جو اہل طمع اور خواہش تھے حضرت سے رخصت ہو گئے اور جو نیکبخت اور سعید تھے انہوں نے حضرت کا ساتھ

وَقِيلَ لَهُ يَا ابْنَ الرَّسُولِ أَتَأْمَنُ ... الَّذِينَ عَلَى قَتْلِ ابْنِ عَمِّكَ أَقْدَمُوا

اور حضرت کی خدمت میں کسی نے عرض کی کہ کیا آپ امن کا خیال کرتے ہیں اُن لوگوں سے جنہوں نے آپکے ابن عم کے قتل پر اقدام کیا

فَقَالَ لَهُ مُسْتَعْبِرًا مُتَرَحِّمًا ... عَلَى مُسْلِمٍ وَاللّٰهِ قَدْ فَازَ مُسْلِمُ

حضرت نے آنکھوں میں آنسو بھر کے مسلم کے حال پر ترحم کر کے فرمایا قسم بخدا مسلم فایز و رستگار ہوئے

فَمَضَى مَا عَلَيْهِ وَالَّذِي هُوَ لَازِمٌ ... عَلَيْنَا فَبَاقٍ يُرْتَجَى وَيُوَمَّمُ

جو حق خدا تھا اُنپر انہوں نے اُسکو ادا کیا اور جو ہم پر لازم ہے وہ باقی ہے اُسکی امید ہے اور اُسکا ارادہ ہے

فَإِنْ تَكُنِ الدُّنْيَا تُعَدُّ نَفِيسَةً ... فَدَارُ ثَوَابِ اللّٰهِ أَعْلَى وَأَعْظَمُ

پس اگر دنیا عمدہ اور نفیس سمجھی جائے تو دار ثواب الٰہی بزرگ تر اور عظیم تر ہے

وَإِنْ تَكُنِ الْأَبْدَانُ لِلْمَوْتِ أُنْشِئَتْ ... فَقَتْلُ امْرِءٍ بِالسَّيْفِ فِي اللّٰهِ أَكْرَمُ

اور جب کہ ابدان خلق موت کے لئے پیدا ہوئے ہیں تو انسان کا راہ خدا میں تلوار سے قتل ہونا بہتر موت ہے

وَسَارَ وَلَمْ يَعْبَأْ بِلَوْمَةِ لَائِمٍ ... لِمَا كَانَ قَدْ مَا بِالشَّهَادَةِ يَخْزُمُ

پھر حضرت روانہ ہوئے اور کسی لائم کی ملامت کی طرف اعتنا نہ فرمائی اس لیکہ ہمیشہ سے شہادت کا عزم بالجزم تھا

وَإِنَّ الْمُحِبَّ الصَّافِيَ الْوُدِّ يَبْتَغِي ... زِيَادَةَ مَنْ يَهْوَى وَإِنْ لَامَ لُوَّمُ

اور جو دوست خالص الوداد ہوتا ہے وہ اپنے معشوق کی دیدار کا خواہاں ہوتا ہے اگرچہ ملامت کرنیوالے ملامت کریں

فَلَمَّا خَطَّ بِالطَّوْفِ تَوَقَّفَ ... الْجَوَادُ لِيَقْضِيَ أَمْرَهُ الْمُتَحَتِّمُ

پس جب کہ زمین کربلا پر پہنچے حضرت کا گھوڑا رک گیا تاکہ جو حکم محکم و مشیت خدا ہے پورا ہو جائے

فَقَالَ وَمَا اسْمُ الْأَرْضِ فَاهُوَ الْبَرَلَا ... فَقَالَ لَهَا شَانٌ خَطِيرٌ وَمُعْظَمُ

اس وقت حضرت نے نام زمین پوچھا لوگوں نے عرض کی کربلا ہے فرمایا کہ اسکی شان تو بہت بلند و عظیم ہے

هُوَ الْمَقْصِدُ الْأَقْصَى مَنَاخُ رِكَابِنَا ... بِذَا لِكَ أَدْرَى النَّبِيُّ الْمُكَرَّمُ

یہی تو منتہائے آرزو ہے اور ہماری سواری کی اقامت کی جگہ ہے اسکی خبر دی ہے مجکو نانا رسالتمآب نے

وَهٰذَا مَقَامٌ قَدْ بَكٰى فِيهِ حَيْدَرٌ ۔۔۔ وَمِنْ قَبْلِهٖ نُوحٌ وَحَوَّا وَآدَمُ

یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے پدر بزرگوار حیدر کرار نے گریہ کیا اور اُن سے پہلے نوح اور حوا و آدم نے

وَهٰذَا مَقَامٌ فِيهِ سُفْكُ دِمَائِنَا ۔۔۔ وَلَا ضَيْرَ فَلْيُوضَعْ هُنَالِكَ مَخْيَمُ

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے خون بہائے جائیں گے اور کچھ قباحت نہیں ہمارے خیمے نصب ہوں

فَلَمَّا تَبَدّٰى فِي ذَرِيهِ وَمِنْهُمْ ۔۔۔ عَلِيٌّ وَعَبَّاسٌ وَعَوْنٌ وَقَاسِمُ

پس جب حضرت رونق افروز ہوئے اپنے عزیزوں کے حلقہ میں کہ انہیں علی اکبر اور عباس اور عون و قاسم تھے

وَفِي عُصْبَةٍ مِنْ صَحْبِهٖ كَانَ مِنْهُمُ ۔۔۔ زُهَيْرُ بْنُ قَيْنٍ وَالْحَبِيبُ وَمُسْلِمُ

اور اپنے اصحاب کے گروہ میں جن میں زہیر بن قین اور حبیب ابن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ تھے

أَضَاءَتْ عَرَاضَ الْأَرْضِ مِنْهُ وَمِنْهُمُ ۔۔۔ كَأَنَّ هُنَالِكَ رَاحَ إِلَيْهِ أَنْجُمُ

تو اُس وقت تمام زمین کربلا حضرت اور حضرت کے اصحاب و اقربا کے نور سے روشن ہو گئی گویا وہاں ماہتاب روشن تھا جسکے گرد ستارے تھے

فَنَادٰى لِأَهْلِ الشَّامِ هَلْ تَعْرِفُونَنِي ۔۔۔ فَجَدِّي نَبِيُّ لِلرِّسَالَةِ خَاتِمُ

پھر حضرت نے اہل شام کو ندا دی کہ آیا تم مجکو جانتے ہو میرے نانا وہ نبی ہیں جن پر رسالت کا خاتمہ ہوا

وَإِنَّ عَلِيًّا وَالِدِي أَفْضَلُ الْوَرٰى ۔۔۔ وَأَكْثَرُهُمْ حِلْمًا وَعِلْمًا وَأَعْظَمُ

اور علی ابن ابی طالب میرے والد ہیں جو بہترین خلق ہیں اور سب اصحاب سے علم و حلم میں زیادہ اور بزرگتر ہیں

وَجَعْفَرُ الطَّيَّارُ عَمِّي وَجَدَّتِي ۔۔۔ خَدِيجَةُ نَ الْكُبْرٰى وَأُمِّي فَاطِمُ

اور جعفر طیار میرے چچا ہیں اور خدیجۃ الکبریٰ میری نانی ہیں اور فاطمہ زہرا میری مادر گرامی ہیں

وَسَيْفُ رَسُولِ اللّٰهِ سَيْفِي وَهٰذِهٖ ۔۔۔ عِمَامَتُهُ إِنِّي بِهَا مُتَعَمِّمُ

اور میرے پاس جو تلوار ہے وہ سیف رسول خدا ہے اور یہ عمامہ بھی انہیں کا ہے جسے میں اپنے سر پر رکھے ہوں

فَقَالُوا نَعَمْ أَنْتَ ابْنُ أَحْمَدَ بَيْدَ ۔۔۔ أَنَّكَ الْيَوْمَ مَقْتُولٌ فَمَا تَتَكَلَّمُ

جواب دیا اُن بیحیاؤں نے کہ ہاں آپ فرزند رسول ہیں مگر آج تو آپ قتل کئے جائیں گے پھر جو آپ فرماتے ہیں بیسود ہے

هُنَالِكَ اصحابُ الحُسَيْنِ تَسابَقُوا وَدَرَّعَ بَعْضًا بَعْضُهُمْ يَتَقَدَّمُ

اسوقت تو اصحاب حسین سے تاب نہ ہوئی اور شوق جہاد میں بڑھنے لگے اور ایک نے دوسرے سے رخصت ہو کر پیشقدمی شروع کی

فَفازُوا بِجَنّاتِ النَّعِيمِ تَشَوُّقًا وَلَمْ يَكُ فِيهِمْ واحِدٌ يَتَأَلَّمُ

پس وہ بمقتضائے شوق خاص بجنات نعیم ہوئے اور کوئی اُن میں ایسا نہ تھا جسکو غم والم اور اندوہ ہو

وَلٰكِنْ وُجُوهٌ مُشْرِقاتٌ نَواضِرٌ عَلَيْها مِنَ الهَيْجاءِ غَيْمٌ مُغَمِّمُ

بلکہ سب کے چہرے چمکتے تھے خوشی میں اور تر و تازہ تھے کہ اُن پر غبار معرکہ کا ایک ابر سایہ فگن تھا پر آب

وَكانَ يُرَى النُّقْصانُ فِيهِمْ بِواحِدٍ وَلَمْ يَكُ جُنْدُ الشّامِ بِالأَلْفِ يُهْزَمُ

اور وہ اتنے کم تھے کہ ایک کی نقصان سو اُنمیں نقصان معلوم ہو جاتا تھا اور لشکر شام ہزار کے مرنے سے بھی شکستہ نہ کھاتا تھا

وَلَمّا طَفا أَصْحابُهُ بِقَضِيضِهِمْ تَرَخَّصَ مِنْهُ أَهْلُهُ وَتَقَدَّمُوا

اور جبکہ اصحاب حسین مظلوم سب شہید ہو چکے اسوقت حضرت کے عزیزوں نے رخصت لی اور جہاد کے لیے آگے

فَجاءَ غُلامٌ مُخْجِلُ الشَّمْسِ وَجْهُهُ حَقِيقٌ بِأَنْ يُدْعَى لَهُ حِينَ يُسْلِمُ

تو ایک لڑکا صاحبزادہ برآمد ہوا جسکا چہرہ آفتاب کو خجل کرتا تھا لایق اسکے کہ جب سکو دیکھیں اسکے حق میں دعا خیر کریں

فَوَجَّهَهُ نَحْوَ البَرَا أَرادَ مَشِيَهُ إِلَى الجُنْدِ ظَمْآنًا بِيُمْناهُ مِخْذَمُ

حضرت نے اسکو جنگ کی طرف بھیجا مگر جب وہ لشکر شام کی طرف تشنہ کام ہاتھ میں شمشیر لے کر روانہ ہوا

رَآهُ أَبُوهُ الطُّهْرُ نَظْرَةَ آيِسٍ وَأَرْخَى عُيُونًا وَهْوَ الغَيْظُ يَكْظِمُ

تو پدر بزرگوار نے نظر یاس سے اُس کی طرف دیکھا اور آنکھوں کو جھکا لیا اور غم و غصہ کو ضبط کیا

فَقاتَلَ أَبْطالًا وَعادَ إِلَى أَبِيهِ يَشْكُو اوامَاوَ القِتالُ مُاقِمُ

پھر اُس صاحبزادہ نے بہادروں سے جہاد کیا اور اپنے باپ کی خدمت میں آکر پیاس کی شکایت کی اور جنگ سے پیاس بڑھ جاتی ہے

فَقالَ لَهُ وَيْلَاهُ مِنْ أَيْنَ آتِيكَ أَسْتَقِيكَ مَاءً وَلٰكِنَّ الأَدَى مُتَصَرِّمُ

جواب دیا اُن حضرت نے کہ افسوس پانی کہاں سے کہاں سے پلاؤں مگر یہ مصیبت جلد تمام ہو جائیگی

سَتَلْقَى وَشِيكًا جَدَّكَ الطُّهْرَ وَتَنْظُرُ فَيَسْقِيكَ مَاءً مِنْهُ رَيَّكَ دَائِمُ

عنقریب اپنے جد بزرگوار سے تم ملاقات کروگے اور اُنکا انتظار کروگے وہ تم کو ایسا پانی پلائیں جس سے ہمیشہ سیراب ہو

فَآبَ إِلَيْهِمْ ثُمَّ شَدَّ عَلَيْهِمُ فَظَلَّتْ لَهُ أَهْلُ الْقِتَالِ تَغَمْغَمُ

پھر اُس صاحبزادہ نے رجوع کی لشکر کی طرف اور اُنپر حملہ کیا اور اہل جنگ نے اُس کی جانب نعرے کرنے شروع کئے

إِلَى أَنْ رَمَاهُ مُنْقِذٌ فَدَعَا الْحُسَيْنَ أَنَّ هُنَا جَدِّي عَلَيْكَ يُسَلِّمُ

تا اینکہ منقذ ملعون نے ایک پتھر مارا پس علی اکبر نے امام حسین کو پکارا کہ میرے جد بزرگوار یہاں سے ہیں آپ پر سلام کرتے ہیں

وَمَاتَ فَلَاقَاهُ الْحُسَيْنُ مُرَمَّلًا طَرِيحًا عَلَى الرَّمْضَاءِ لَا يَتَكَلَّمُ

یہ کہہ کر انتقال کیا اور امام حسینؑ نے آکر خاک پر غلطاں پایا کہ زبان بھی اس نوجوان کی بند تھی

فَقَالَ عَلَى دُنْيَاكُمُ بَعْدَهُ الْعَفَا وَوَيْلٌ لَكُمْ يَا قَوْمُ مِمَّا فَعَلْتُمُ

پھر فرمایا کہ بعد ایسے فرزند کے تمہاری دنیا پر خاک ہے اور وائے ہو اے قوم نابکار تم پر اس ظلم عظیم پر

وَجَاءَتْ إِلَيْهِ زَيْنَبٌ مِنْ خِيَامِهَا أَكَبَّتْ عَلَيْهِ وَهِيَ لِلْوَجْهِ تَلْطِمُ

اسکے بعد حضرت زینب بیتابانہ خیمہ سے نکلکر وہاں تک آئیں اور نعش پر اپنے تئیں گرادیا اور منہ پر طمانچے مارتی تھیں

فَبَارَزَ كُلٌّ وَاحِدٌ بَعْدَ وَاحِدٍ وَمِنْ رَبِّهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا تَقَاسَمُوا

اسی طرح ہر ایک بعد ایک کے جہاد کو نکلا اور اپنے پروردگار سے اجر عظیم لے کر باہم تقسیم کیا

بِنَفْسِي شِفَاهٌ ذَابِلَاتٌ مِنَ الصَّدَى تُسَبِّحُ لِلرَّحْمٰنِ حِينَ تُكَلِّمُ

فدا ہو میری جان اُن لبوں پر جو پیاس سے خشک ہو گئے اور جب کلام کرتے تھے تسبیح خدا کرتے تھے

بِنَفْسِي جِبَاهٌ دَامِيَاتٌ تَعَفَّرَتْ وَكُومٌ سَجَدْتُ لِلّٰهِ وَاللَّيْلُ مُظْلِمُ

فدا ہو جان میری اُن پیشانیوں پر جو خون آلودہ ہو کر خاک میں بھر گئیں اور کسقدر شب تاریک میں سجدۂ خدا میں مشغول ہیں

ثَلَاثُ لَيَالٍ قَدْ مَضَيْنَ عَلَى الْوَلَا يَا مَاؤُهَا وَالْمَاءُ عَلَيْهِمْ مُحَرَّمُ

تین راتیں پیاسے مع دنوں کے گزر گئیں کہ پانی اُن پر گویا حرام ہو گیا تھا

إِذَا الْتَمَسُوا مِنْهُمْ مِنَ الْمَاءِ جُرْعَةً دَعَوْهُمْ إِلَى نَارٍ مِنَ الْحَرْبِ أُضْرِمُوا

جس وقت اُن ملاعین سے پانی کا ایک گھونٹ مانگتے تھے تو وہ آتش حرب کی طرف جسکو روشن کیا تھا طلب کرتے تھے

فَلَمَّا مَضَى الْعَوْنَانِ لِسَبِيلِهِمْ وَلَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ وَاحِدٌ يَتَقَدَّمُ

پس جب کہ انصار حضرت کے سب درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور کوئی باقی نہ رہا جو جہاد کرتا

فَنَادَى حُسَيْنٌ وَهُوَ يَنْظُرُ حَوْلَهُ وَمَا حَوْلَهُ إِلَّا الْأَفَاعِي وَالصَّوَارِمُ

اس وقت حضرت امام حسینؑ نے ہر طرف نظر کی اور سوا نیزہ و شمشیر کے کچھ نہ دیکھا پس ندا کی فریاد کی

فَقَالَ أَلَا فِيكُمْ مُحِبٌّ يُحِبُّنَا أَلَا ذَبَّ عَنَّا يَحْمِي وَيَرْحَمُ

اور کہا کہ تم میں کوئی ایسا ہے جو ہمارا دوست ہو کوئی ایسا ہے جو رحم کھا کر ہماری حمایت کرے

وَهَلْ مِنْ مُغِيثٍ أَوْ مُعِينٍ يُعِينُنَا وَيَرْجُو مِنَ الرَّحْمَنِ مَا هُوَ أَدْوَمُ

آیا کوئی فریادرس یا معین ہے جو ہماری اعانت کرے اور خدا سے اُس نعمت کا امیدوار ہو جو دائمی ہے

فَسَالَتْ دُمُوعٌ لَوْ تَرَاهَا الْخَلِيلُ قَلَائِدَ دُرٍّ فِي الْخُصَى تَتَصَعَّمُ

اسوقت آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے کہ اگر تو دیکھے تو خیال کرے کہ موتی کی گلوبند گریزوں میں پاشیدہ ہو گئے ہیں

بَنَاتٌ عَلِيٍّ بَاكِيَاتٌ صَوَارِخٌ دَعَوْنَ ثُبُورًا أَوِ الطَّعَامُ تَضَاغَمُوا

اور دختر حیدر کرار گریہ وزاری اور نالہ و فریاد کرتی تھیں اور واویلا کرتی تھیں اور اہل شام ہجوم کئے ہوئے تھے

فَكَرُّوا وَفَرُّوا خَائِفِينَ كَأَنَّهُمْ ثَعَالِبُ فِيهِمَا بَيْنَهَا جَاسَ ضَيْغَمُ

پس حضرت نے حملہ کیا اور اعدا خوف سے بھاگے گویا وہ سب روباہ تھے کہ ایک شیر زن میں آگیا تھا

وَلَمْ يَرَ مَكْسُورًا وَحِيدًا مِنَ الْأَنَامِ أَرَابَطَ جَاشًا مِنْهُ قَطُّ وَأَقْوَمُ

مگر حضرت باوجود زخموں کے اور تنہائی کے ایسے مستقل اور پُردل تھے کہ کوئی مثل حضرت کے دیکھا نہیں گیا

بِنَفْسِيَ طِفْلٌ قَدْ رَمَاهُ ابْنُ كَاهِلٍ رَضِيعًا وَعَطْشَانًا وَمَا كَادَ يَفْطِمُ

فدا ہو جان میری اُس بچہ شیر خوار تشنہ کام پر جسکو حرملہ بن کاہل نے نشانہ تیر ظلم کیا حالانکہ ابھی دودھ بھی نہ چھوٹا تھا

وَلِلّٰهِ فِی لَسْهِمٍ سَمَّهُ الْقَوْمُ قَدْ اَصَابَ قَلْبَ اِمَامٍ قَلْبُهُ مُتَقَسِّمُ

اور افسوس اُس تیر پر جسکو قوم نے زہر میں بجھایا تھا اور وہ اُس امام کے دل پر پڑا جسکا دل غم سے پارہ پارہ تھا

فَاَخْرَجَهُ مِنْ ظَهْرِهٖ وَلَئِنْ تَرٰی لَخِلْتَ مِنَ الْمِیْزَابِ یَنْبَعِثُ الدَّمُ

اُس تیر سہ پہلو کو حضرت نے پشت کی طرف سے نکالا اور مثل پرنالہ کے خون اُس زخم سے جاری ہوا

فَاَصْبَحَ مَوْلَانَا الْحُسَیْنُ کَمُنْفَذٍ عَلَیْهِ جِرَاحَاتٌ بِهَا الدِّیْنُ یَثْلَمُ

پس حضرت امام حسین مثل سپاہی کے ہوگئے بسبب کثرت تیروں کے اور حضرت پر وہ زخم تھے جس سے دین میں رخنہ پڑ جائے

وَشَمِّرْ شِمْرًا اَوْسِنَانٌ بِقَتْلِهٖ فَاَحْدَثَ مَا عَنْ ذِکْرِهٖ اَتَاَثَّمُ

اور بنا بر اختلاف روایات کے شمر یا سنان ملعون مستعد ہوگیا حضرت کے قتل پر اور وہ ظلم کیا جسکے ذکر کی مجکو تاب نہیں

فَحِیْنَئِذٍ قَدْ نَاحَتِ الْجِنُّ فِی الْفَلَا وَرَنَّ حَمَامٌ کَانَ قَبْلُ یَرُنَّمُ

پس اُس وقت قوم جن نے بیابان میں نوحہ کیا اور وہ کبوتر جو ترنم کرتے تھے حضرت کے غم میں گریاں ہوئے

وَهَبَّتْ رِیَاحٌ عَاصِفَاتٌ خِلَالَهَا غُبَارٌ شَدِیْدٌ لَا یُسَاوِیْهِ عَظْلَمُ

اور وہ ہوائیں تند چلیں جن میں غبار شدید تھا کہ تاریکی شب سے اس کی تاریکی زاید تھی

وَاَظْلَمَتِ الْاٰفَاقُ وَانْکَسَفَ الذَّکَا ءُ جَنَّتْ بَدَتْ وَقْتَ الظَّهِیْرَةِ اَنْجُمُ

اور تمام آفاق تیرہ و تار ہوگئے اور آفتاب کو گہن لگ گیا تا اینکہ وقت دوپہر کے ستارے نکل آئے

وَاَصْبَحَتِ الْجُدْرَانُ اَحْمَرَ کَاَنَّهَا مَلَاحِفُ مُطْلًی عَلَیْهِنَّ عَنْدَمُ

اور دیواریں ایسی سرخ ہوگئیں گویا کہ وہ چادریں تھیں جن پر سرخ رنگ تیز تھا

وَاَثَّرَ فِی الْبَیْتِ الْمُقَدَّسِ غَمُّهٗ فَسَالَ مِنَ الْاَحْجَارِ دُرٌّ فَعَنْدَمُ

اور بیت المقدس میں بھی حضرت کے غم و ماتم نے اثر دکھایا کہ جو پتھر اُٹھایا گیا اُسکے نیچے سے خون تازہ نکلا

وَقَدْ اَخَذُوا الْبَعْضَ الْجِمَالِ فَذَبَّحُوْا فَذَاقُوْهُ مَطْبُوْخًا اِذَا هُوَ عَلْقَمُ

اور لوگوں نے ایک اونٹ کو ذبح کیا پکوکر اور اُس کو پکا کر کھایا تو اُسکا گوشت مانند زہر کے تلخ پایا

وَلَا عَجَبَ مِنْ تِلْكَ الْعَرَائِمِ اِذْ بَدَتْ ۔۔۔ فَاِنَّ مَصَابَ الطُّهْرِ اَدْهٰى وَاَفْحَمُ

اور کیا تعجب کا مقام ہو ان امورِ عظیمہ پر جو ظاہر ہوئے اسلئے کہ مصیبتِ امام پاکیزہ کی نہایت بڑی مصیبت ہے

فَاَیُّ دَمٍ قَدْ اَهْرَقَتْهُ سُیُوْفُهُمْ ۔۔۔ وَاَیُّ شَنِیْعٍ قَارَفُوْهُ وَاَجْرَمُوْا

کس خون کو اُن ملعونوں کی تلواروں نے بہایا اور کونسا گناہ عظیم عمل میں لائے اور ظاہر کیا

وَلِلّٰهِ مَنْ صُبَّتْ عَلَیْهِ مَصَائِبٌ ۔۔۔ لَکُلِّ الْفَتٰی عَنْ ذِکْرِهِنَّ وَیُهْجَمُ

کیا مرتبہ ہے پیش خدا اُسکا جس پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ آدمی اُس کے ذکر سے تھک جائے اور عاجز آئے

وَمَا کُنْتُ اَنْسٰی حِیْنَ عَادَ جَوَادُهُ ۔۔۔ اِلٰی بَابِ فُسْطَاطِ النِّسَاءِ یُحَمْحِمُ

اور میں نہیں بھولتا جب کہ حضرت کا ذوالجناح دروازۂ خیمۂ اہلِ حرم پر ہمہمہ کرتا ہوا گریاں آیا

فَشَاهَدْنَهُ وَالسَّرْجُ عَارٍ وَظَهْرُهُ ۔۔۔ جَرِیْحٌ سِهَامٍ مِنْهُ یَنْسَکِبُ الدَّمُ

اور اہلِ حرم نے دیکھا کہ زین خالی ہے اور اُس کی پشت تیروں سے زخمی ہو اور اُس سے خون جاری ہو

فَکَمْ مِنْ جُیُوْبٍ لِلنِّسَاءِ شُقِّقَتْ ۔۔۔ وَکَمْ مِنْ خُدُوْدٍ کَانَتِ الْیَوْمَ تُلْطَمُ

پس کتنے گریبان اُسکو دیکھکر اُن بے وارثوں کے پارہ پارہ ہوئے اور کتنے رخسار تھے جن پر اُنھوں نے غم میں طمانچے لگائے

وَحِیْنَ خَیَامَ الْفَاطِمِیَّاتِ اُحْرِقَتْ ۔۔۔ وَفِیْهَا اللِّئَامُ الْغَاشِمُوْنَ تَقَحَّمُوْا

اور اُس وقت کو نہیں بھولتا ہوں جبکہ دختران فاطمہ کے خیموں میں آگ لگا دی گئی اور اہلِ ظلم درانہ اُن خیموں میں در آئے

وَاُخْرِجَتِ النِّسْوَانُ اَعْنُفَ اَخْرَجٍ ۔۔۔ فَشَاهَدْنَ فِی الرَّمْضَاءِ مَا هُوَ مُؤْلِمُ

اور وہ مخدرات عصمت اُن خیموں سے برہنہ سر نکالی گئیں اور جلتی ریت پر ایسا کچھ دیکھا جس سے دل دردناک ہو

حُسَیْنٌ جَرِیْحٌ بِالدِّمَاءِ مُضَرَّجٌ ۔۔۔ وَمَا الْجِرَاحَاتُ اَصَابَتْهُ مُرْهَمُ

دیکھا کہ امام حسینؑ زخمی و آغشتہ بخون ہیں اور جو زخم کہ حضرت کو پہنچے اُنکے لئے دوا ہے نہ مرہم

حُسَیْنٌ ذَبِیْحٌ بِالْعَرَاءِ مُرَمَّلٌ ۔۔۔ مُحَنَّطُهُ تُرْبٌ وَغَاسِلُهُ دَمُ

امام حسینؑ سیدانِ کربلا میں خاک آلودہ ہیں کہ حنوط حضرت کا مٹی ہے اور آبِ غسل خون ہے

بِهٖ قُتِلَ الْاِسْلَامُ وَالدِّیْنُ وَالتُّقٰی ۔۔۔ وَبِیَکْیِهٖ بِالْبَطْحَآءِ خَیْفٌ وَزَمْزَمُ

حضرت کے قتل سے اسلام اور دین اور تقوے قتل ہوگیا اور اُن پر خیف اور زمزم مکہ میں گریاں ہے

اَیَا سَاکِنِیْ بِشَامٍ وَیَا اَهْلَ کُوْفَةٍ ۔۔۔ اَهٰذَا اَوْصَی النَّبِیُّ الْمُکَرَّمُ

اے ساکنانِ شام اور اے اہل کوفہ کیا رسالت مآب نے تم کو یہ ہی وصیت فرمائی تھی

عَاشَرَ بَتْمُوْ اِمَاءَ الْفُرَاتِ خُیُوْلَکُمْ ۔۔۔ وَاَوْلَاهُ لِلصَّلٰوةِ یَتَیَمَّمُوْا

کہ تم نے اب فرات سے اپنے گھوڑوں تک کو سیراب کیا اور اولاد رسول نے سامنے فرات کے نماز کیلئے تیمم کیا

وَیَا وَیْلَکُمْ تُسْبٰی بَنَاتُ مُحَمَّدٍ ۔۔۔ کَاَنَّ عَلَیْهِنَّ تُرْکٌ وَزَنْجٌ وَدَیْلَمُ

وائے ہو تم پر دختران محمد مصطفےٰ کو تم نے اسطرح مقید کیا کہ گویا بندی انکی شکل بندی ترک وزنگ دیلم کی تھے

تُسُوْقُوْنَ زَیْنَ الْعَابِدِیْنَ مُصَفَّدًا ۔۔۔ وَفِیْ قَدَمَیْهِ شَوْکَةٌ وَنَوَرَّمُ

امام زین العابدین کو تم اس طرح قید میں جکڑ کر لے گئے کہ اُن کے پانوں میں کانٹے تھے اور ورم

تُدَارُ رُؤُسُ الْاَطْیَبِیْنَ عَلَی الْقَنَا ۔۔۔ وَلَا مُنْکِرٌ فِیْکُمْ وَلَا مُتَلَوِّمُ

ان بزرگواران پاک و پاکیزہ کے سر نیزوں پر پھرائے جاتے ہیں اور تم میں کوئی اس امر شنیع کو برا نہیں جانتا اور نہ غمگین ہوتا ہے

یَا لَیْتَ عَیْنِیْ تَنْظُرُوْنَ اِلَی النَّبِیِّ ۔۔۔ حِیْنَ یُنَادِیْ وَیْلَکُمْ مَا صَلَغْتُمْ

کس آنکھ سے تم رسولخدا کی طرف دیکھو گے جس وقت روز قیامت تمہیں پکارینگے کہ وائے ہو تم پر تم نے میری اولاد کیساتھ کیا کیا

قَتَلْتُمْ حُسَیْنًا لِاسْتِطَابَةِ فَاسِقٍ ۔۔۔ وَعَمَّا قَرِیْبٍ تَنْدَمُوْنَ وَتَنْدَمُ

اور فرمائیں گے کہ تم نے میرے حسین کو ایک فاسق کی خوشی کے لئے قتل کر ڈالا اور عنقریب تم اور وہ سب نادم ہوگے

فَرَیْتُمْ کَبُوْدِیْ وَاِذْ تَجْتَثُّمْ شَفَاعَتِیْ ۔۔۔ وَاِنَّ جَزَا الظَّالِمِیْنَ جَهَنَّمُ

تم نے میرے پارہ ہائے جگر کو قطع کیا اور پھر شفاعت کے امیدوار ہو اور ظالم کی جزا تو دوزخ ہے

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ عَلَیْهِمْ ۔۔۔ جَمِیْعًا وَسُخْطُ اللّٰهِ اُخْرٰی وَاَعْظَمُ

لعنت ہو خدائے غالب کی اُن سب پر ۔۔۔ اور عذاب خدا نہایت عظیم اور رسوا کنندہ ہے

اَعَبَّاسُ مَهْلًا فَالْمَصَائِبُ جَمَّةٌ فَلَمْ يُحْصِيهَا نَثْرٌ وَلَا هِيَ تَنْتَظِمُ

اے عباس قلم کو روک کہ مصائب بے انتہا ہیں نہ تو انکا نثر میں احاطہ ہوسکتا ہے اور نہ وہ نظم ہوسکتی ہیں

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ اَهْلَ بَيْتِ رِسَالَةٍ بِكُمْ بُدِءَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَيُخْتَمُ

اے اہل بیت رسالت تم پر سلام ہو تم سے ابتدا ہے ذکر حکیم کی اور تمہیں پر خاتمہ ہے

LIBRARY HYDERABAD

کلام فارسی

عربی کی طرح فارسی میں بھی مرثیہ گوئی کا میدان بہت تنگ نظر آتا ہے۔ وہی دس دس بیس بیس شعر کے قطعہ یا محدود مثنوی میں واقعات اور جذبات کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عجمی نہایت ذہین و زیرک ہوتے ہیں اور سیکڑوں برس سے مذہب شیعہ وہاں حکمرانی کر رہا ہے لیکن میدانِ مرثیت نے زیادہ کشایش حاصل نہیں کی۔ ہاں دوسرے اصناف سخن میں بڑے بڑے زبردست شاعر اور سخن آفریں نظر آتے ہیں جن پر ایران فخر کر رہا ہے۔ جیسے فردوسی، نظامی وغیرہ

میرا ارادہ تھا کہ شاہنامہ فردوسی و سکندر نامہ نظامی و حملہ حیدری ملا محمود علی کرمانی و حملہ حیدری ملا رفیع باذل و صولت فاروقی میں سے چند لڑائیاں لکھ کر ہر لڑائی کے مقابلہ میں میر انیس کے اندازِ جنگ کو دکھایا جائے تاکہ دیکھنے والے دیکھ سکیں کہ سخن طرازانِ فارسی کے مقابلہ میں سخن طرازِ اردو نے کیا کام کیا ہے اور فارسی اور اردو کے میدانِ جنگ میں کس آن بان سے لڑتے ہیں کس گھمسان کی لڑائی ہو رہی اور کس غضب کی تلوار چل رہی ہے۔ کون کس حربے سے کام لے رہا ہے لیکن میرے گریجویٹ دوستوں نے کہا کہ زمانہ اس ژرف نگاہی کی داد دینے کو تیار نہیں۔ اردو خواں دنیا

میں فی صدی پانچ بھی ایسے موازنہ سے دلچسپی ظاہر کرنے والے نہیں۔ اس لئے میں اُس خیال کو نہایت محدود طور سے ظاہر کرتا ہوں۔

ناظرین ہر مقام کے طرز کلام کو دیکھیں کہ فارسی میں کس بات کو کن لفظوں میں ادا کیا گیا ہے اور میر انیس نے اُسی بات کو کس رنگ سے مرقع تصویر بنایا ہے۔

جنگ دارا و سکندر

نظامی سکندر نامہ میں لکھتے ہیں ؎

رسیدند لشکر بجائے مصاف	دو پرکار[1] بستند چوں کوہ قاف
خسک بر گزرگاہ کیں ریختند	نقیباں خرد شیدن انگیختند
ز سُمِ ستوراں دراں پہن دشت	زمیں شش[2] شد و آسماں گشت ہشت
سپہدار ایراں ہم از صبح بام	برآراست لشکر بسانِ نظام
نخستیں صف میمنہ ساز کرد	ز تیغ اژدہا را دہن باز کرد
صفِ میسرہ ہم برآراست چست	یکے کوہ گفتی ز پولاد درست
جناح آں چناں بست در پیش گاہ	کہ پوشیدہ شد روئے خورشید و ماہ
ز قلبے کہ چوں کوہ پولاد بود	بنا ہندہ را قلعہ آباد بود
ز دیگر طرف لشکر آرائے روم	برآراست لشکر چو نخلے ز موم
چپ و راست آراست از ترک و تیغ	چو آرایشِ گلبن از اشک میغ
پس و پیش را کرد چوں خار کوہ	برانگیخت قلبِ ثریا شکوہ
چو از ہر دو سو لشکر آراستند	یلاں سو بسو مردمی خواستند
ز شمشیر برکشتہ جائے نبود	کہ در غارِ او اژدہائے نبود

[1] دو پرکار یعنی دو حلقہ ۱۲ [2] یعنی یک طبق خاک برآسمان رفت ۱۲

نهنگِ خدنگ از کمینِ کمان — نیاسود بر یک زمین یک زمان
کمند اژدهائے مسلسل شکنج — دهن باز کردہ بتاراج گنج
چناں گرم شد آتشِ کارزار — کہ از نعلِ اسپاں برآمد شرار
درایں سو سکندر ز شمشیر تیز — برانگیختہ از جہاں رستخیز
دو دستی چناں میگزارید تیغ — کز و خصم را جاں نیاید دریغ
چو بر فرق پیلے آمدے خنجرش — فرو ریختے زیر پالش سرش
چو بر آب دریا غضب ریختے — ز دریائے آب آتش انگیختے
چو شیر یکہ آتش ز دم برزند — دم بادپارا بہم برزند

آگے بڑھکر گھمسان کی لڑائی میں لکھتے ہیں ۵

برآمد ز قلبِ دو لشکر خروش — رسید آسماں را قیامت بگوش
تبیرہ یغ بیدچوں تند شیر — درآمد بہ رقص اژدہائے دلیر
ز شوریدنِ نالہ کرنائے بز — برافتاد تپ لرزہ بر دست پائے
ز فریاد رویئں خم از پشتِ پیل — نفیرِ نہنگاں برآمد ز نیل
ز بس بانگ شیپور زہرہ شگاف — بدریدز زہرہ بہ پیچید ناف
ز غریدنِ کوس خالی دماغ — زمیں لرزہ افتاد در کوہ و راغ
ز بس تیر باراں کہ آید بجوش — فگند ابر بارانی خود ز دوش
خروشیدنِ کوس رویئنہ طاس — نیوشندہ را داد بر جاں ہراس
سناں در سناں رستہ چوں نوک خار — سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار
گریزندگاں را دراں رستخیز — نہ روئے رہائی نہ راہِ گریز
کسے از خاصگاں پیش دارا نبود — کز و در دلِ کس مدارا نہ بود
دو سر ہنگ غدار چوں پیل مست — برآں سلیقین بر کشادند دست

درافتاد و دار ابدان زخم تیز	زگیتی برآمد یکے رستخیز
درخت کیانی درآمد بخاک	بغلطید در خون تن رخمناک

نمونه کلام فردوسی از شاهنامه

رزم شاه کاوس بادشاه مازندران

یکے نامدارے ز مازندران	بگردن برآورده گرز گران
که جویا بدش نام و جوینده بود	کرا بنده گرز گوینده بود
عنان را به پیچید برخاست گرد	ز بانگش بلرزید دشت نبرد
نشد هیچکس پیش جویا بروں	ز رگشاں بجنبید گوئی نه خوں
بآواز گفت آں زماں شهریار	چه بود اے دلیران و مردان کار
کزیں دیو دلتاں چنیں خیره شد	از آواز او رویتاں تیره شد
نداد ند پاسخ دلیراں به شاه	زجویا بپرسید مرد گفتی سپاه
یکے برگرائیده رستم عناں	بگردن برآورد رخشاں سناں
بآورد گه رفت چوں پیل مست	پلنگے بزیر اژدهائے بدست
بجویا چنیں گفت کے بدنشاں	نیفگند نامست زگردن کشاں
بگرید ترا آنکه زاینده بود	فرازنده بودار کزاینده بود
بدو گفت گویا که ایمن مشو	زجویا و از خنجر سرورد
که اکنوں بدرّد جگر مادرت	بگرید برایں جوشن و مغفرت
چو رستم شنید ایں سخنها تمام	برآورد یک نعره و گفت نام

گریزان شد آن پهلوان دلیر — تهمتن بغرید مانند شیر
پس پشت او اندر آمد چو گرد — سنان بر کمر بند او راست کرد
برو نیزه بر بند درع و زره — زره را نماند هیچ بند و گره
بیندا خت از پشت اسپش بخاک — دهن پر ز خاک و زره چاک چاک
بفرمود سالار مازندران — بکیکر سپاه از کران تا کران
که سر بر فرازید و جنگ آورید — همه راه و رسم پلنگ آورید
بکمینه ازان لشکر بی شمار — فراوان بیامد سوی کارزار
سپهدار ایران چو زانگونه دید — ز جا اندر آمد چنان چون سزید
بر آمد ز هر دو سپه بوق و کوس — هوا نیلگون شد زمین آبنوس
همه یکسره تیغ کین آختند — بهمدیگران اندر انداختند
چو برق درخشنده از تیره میغ — همی آتش افروخت از گرز و تیغ
هوا گشت سرخ و سیاه و بنفش — ز بس نیزه و گونه گونه درفش
زمین شد بکردار دریای قیر — همه موج بش از خنجر و گرز و تیر
از آواز دیوان و از تیره گرد — ز غریدن کوس اسپ نبرد
شکافید کوه و زمین بر درید — بدانگونه پیکار کین کس ندید
بر آواز رعدست گفتی چنان — دیا روز در تیره شب شد نهان
چکاکاک گرز آمد و تیغ تیر — ز خون یلان گشت دشت آبگیر
جهان یکسره همچو دریا نمود — نهنگ اندر او گرز و شمشیر بود
سواران چو کشتی روان اندر او — بروی اندر آورد از کینه رو
همی گرز بارید بر خود و ترگ — چو باد خزان بار داز نخل برگ
فراوان سر افتاد مانند گوی — دل و سینه ها چاک و خون بد بجوی

سپهدار رستم دل صف شکن
ابا جان سنان تیغ دشمن فگن

نشسته برخش اندران همچو کوه
در افگنده تن را بدیوان گروه

ز باره چو بگزارد وے تیغ تیز
ز دیوان برآورد وے اوستخیز

بیک زخم ده سر فگندے ز دوش
بنعره بکندے دل شیر روش

ز گرزش دل آسمان چاک شد
ز گردش فلک روے پرخاک شد

خدنگش چو از شست کردی گزر
هراسان شدے زان دل شیر نر

کمندش چو تن راست کردی بخم
چو از در کشیدے ملان را به دم

ز پاور کابش جهان خیره ماند
ز تیغش زمین دیده در خون نشاند

بدین گونه زان لشکر نامدار
فراوان بیفگنده در کارزار

جنگ رستم با افراسیاب

دمان رفت تا سوے توران سپاه
یکے نعره زد شیر لشکر پناه

چو افراسیابش بهاموں بدید
شگفتید زان کودک نارسید

ز گرداں بپرسید کایں اژدها
بدینگونه از بند گشته رها

کدامست کایں را ندانم بنام
یکے گفت ایں پور دستان سام

بود رستمش نام و بس سرکش است
که جنگ وے چون آب چون آتش است

به پیش سپه آمد افراسیاب
چو کشتی که موجش برآرد ز آب

چو رستم ورا دید بفشرد ران
بگردن برآورد گرز گران

چو افراسیابش بدانگونه دید
برو چنگ و تیغ از میان برکشید

زمانے بکوشید با پور زال
تهمتن برافراخته چنگ و بال

به بند کمرش اندر آویخت چنگ
جدا کردش از پست زین خدنگ

همی خواست بردن به پیش قباد
وز آنجا بجنگ روز نخستینش یاد

ز هنگ سپهدار و جنگ سوار
نیامد دوال کمر پایدار

گسسته بخاک اندر آمد سرش
سواران گرفتند گرد اندرش

تهمتن فرو برد چنگ دراز
ربود از سرش تاج آن سرفراز

بیک دست رستم کمر مانده بود
بدست دگر تا جش از سر ربود

یکی مژده بردند نزدیک شاه
که رستم بدرید قلب سپاه

بنزدیک سپهدار ترکان رسید
درفش سپهدار شد ناپدید

گرفتش کمربند و افگند خوار
خروشی برآمد ز ترکان نزار

چو این مژده بشنید از او کیقباد
بفرمود تا لشکرش همچو باد

بیکبار بر خیل توران زنند
برو بیخ ایشان ز بن برکنند

ز جای اندر آمد چو آتش قباد
بجنبید لشکر چو دریا ز باد

برآمد خروشیدن دار و گیر
ز خشیدن خنجر و تیغ و تیر

بران ترک زرین و زرین سپر
غمی گشت از چاک چاک تبر

تو گفتی که ابری برآمد ز گنج
ز شنگرف نیزنگ زد بر ترنج

دو لشکر بیک دیگر آویختند
تو گفتی بهم اندر آمیختند

غریدن مرد و غرنده کوس
همی کرد بر رعد غران فسوس

ز آسیب شیران پولاد جنگ
دریده دل شیر و چرم پلنگ

زمین کرده بد سرخ رستم بخنگ
یکی گرزه گاو پیکر بچنگ

بهر سو که مرکب برانگیختی
چو برگ خزان سر فرو ریختی

بشمشیر بران چو بگزاشت دست
سر سرفرازان همی کرد پست

اگر بر زدی بر سران سرفراز
بدو نیمه کردیش با اسپ و ساز

چو شمشیر بر گردن افراختے	چو کوہ از سواراں سر انداختے
ز خونِ دلیراں بدشت اندروں	چو دریا زمیں موج زن شد ز خوں
ہمہ روئے صحرا سر و دست و پائے	بہ زیرِ سمِ اسپِ جنگ آزمائے
ز سمِ ستوراں دراں پہن دشت	زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
فرو رفت و بر رفت روزِ نبرد	بہ ماہی نم خون و بر ماہ گرد
بروزِ نبرد آں یل ارجمند	بشمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
دریدہ بر و یال و شکستہ و بست	یلاں را سر و سینہ و پا و دست

ترکی سے اُردو کا مقابلہ

ترکی اور اُردو ایک ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ اور دونوں کے مدارج ترقی بھی قریب قریب زمانے کے پائے جاتے ہیں۔ ترکی نے استنبول میں سلاطینِ عثمانیہ کے زیرِ نشان اور اردو نے دلی میں سلاطینِ مغلیہ کے زیرِ پرچم نشو و نما حاصل کیا پھر شعر اور ادبانے دونوں کی زمینِ سخن کو آسمانِ بنایا۔ ہندوستان میں ترکی کا رواج نہیں تھوڑے زمانے سے جناب ان شاء اللہ خاں صاحب مدیر وطن نے اُردو میں ترکی کے حالات کا اظہار کیا ہے اسکو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمد چہارم کے عہد میں ترکی شعرا نے ایرانی طرز کی تقلید شروع کر دی تھی اور "نابی" نے میرزا صائب کی تشبیہات اور نازک خیالیوں کی نقل اُتار کر ترکی لٹریچر میں ایک دلچسپ اور قابلِ قدر اضافہ کیا تھا پھر سلطان احمد ثالث کے عہد ۱۷۳۰ء میں سب سے زیادہ مشہور "ندیم" شاعر گزرا ہے جو ممتاز ترین شعرا میں شمار ہوتا ہے وہ اپنے انداز تحریر کا جو تمام ایرانی اور ترکی شعرا سے جداگانہ قسم کا تھا موجد گزرا ہے۔ اور اب تک کسی کو اس کے نقل و تقلید کی جرات نہیں ہوئی۔ اور اگر کسی نے اُسکی تقلید کا حوصلہ کیا تو اسکا کلام اس رتبہ کو نہیں پہنچا۔ جیسے فارسی میں فردوسی

اور اردو میں میرزا غالب کی نظیریں موجود ہیں۔

لیکن اُس کے کلام میں میرزا غالب کے کلام جیسا اغلاق نہیں بلکہ وہ میر تقی کے کلام کی طرح سادہ و پرکار ہے اُس کا طرز تغزل بے نظیر خوبیوں سے آراستہ ہے۔ غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد بھی لکھے ہیں جو فارسی قصائد کی شان و شکوہ کا اظہار کرتے ہیں اور بایں ہمہ وہ اعلیٰ مطالب کو نہایت سلیس پیرایہ میں ادا کرتا ہوا ۱۷۲۳ء میں زندہ تھا مرنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں اس کی تصنیف پر عثمانیہ لٹریچر کا کلاسیکل زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لٹریچر کے فروغ کی ابتدا نفی سے ہوئی اور ندیم کی وفات پر وہ دور ختم ہوا۔ یعنی احمد اول کی تخت نشینی ۱۶۰۳ء سے لیکر احمد ثالث کے عزل ۱۷۳۰ء تک رہا۔

پرانی طرز کے شاعروں میں چار شاعر سب سے زیادہ نام آور ہوئے جن کے تخلص فضولی۔ نفی۔ ندیم۔ غالب ہیں۔ شیخ غالب سلطان سلیم ثالث کے عہد سلطنت میں گزرا ہے اُس کی کتاب "حسن و عشق" شاعرانہ نازکخیالی میں بمثیل خیال کیجاتی ہے اور یہ چاروں شاعر اپنے اپنے طرز کلام میں جوہر فرد سمجھے جاتے ہیں اور ہر ایک نے شاعری کو اپنے مذاق کے حسب حال ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ غالب استنبولی نے بھی غالب دہلوی کی طرح دوسرے کی تقلید کو پسند نہیں کیا۔

سلطان محمود کے عہد میں ترکی لٹریچر کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ترکی شاعری نے یوروپین لٹریچر کی وضع اختیار کی جو بہت جلد وہ ترکی شاعری کا ایک خاص فیشن بن گیا۔

اس دور کے مشہور شاعروں میں واصف اور عزت مولا ہیں اور شاعرات میں فتنت اور لیلیٰ کے کلاموں کو قبولیت خاص حاصل ہے واصف پہلا ترکی شاعر ہے جس نے قسطنطنیہ کی عام بول چال کو شاعری میں داخل کیا۔ پھر انیسویں صدی کے وسط میں اس

دور کی تکمیل کا لگا لگا (جب سے کہ ہندوستان میں اُردو کا پچھلا دور شروع ہوتا ہے) اور ترکی شاعری کی روح نئے قالبوں میں ڈالی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی لٹریچر کا بالکل کایا پلٹ ہوگیا جو دور اول و اوسط سے بالکل نئے قسم کا معلوم ہوتا ہے۔

اس دور کا عام مذاق اس اصول کا پابند ہوگیا ہے کہ شاعری میں صرف آمد کی خوبیاں ظاہر کی جائیں آورد کے تصنع کو بالکل دخل نہ دیا جائے۔ پرانی مسجع اور مقفےٰ عبارتوں اور پیچیدہ اور مغلق ترکیبوں کی جگہ سیدھے سادھے الفاظ اور عام بول چال کا خیال رکھا جاتا ہے اچھے لکھنے والوں کو عمدہ عمدہ الفاظ و محاورات کی تلاش کرنا پڑتی ہے لیکن وہ اشعار کی رنگینی کے لئے نہیں ہوتی بلکہ واقعات اور مدعا کو بہترین طریق سے ظاہر کرنیکے لئے ہوتی ہے۔ ترکی نظم بھی تقریباً یوروپین طرز کی ہوگئی ہے۔ اکثر پرانے الفاظ بیفائدہ ہونیکی وجہ سے متروک ہوگئے ہیں اور بیشمار الفاظ معانی میں جدید خیالات اور تصورات کو ادا کرنے کی ضرورت کو پورا کرنیکے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ڈرامانویسی کا بھی رواج ہوگیا ہے جو پہلے وہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا اور اُردو میں ابتک اس کا چرچا نہیں پرانے طرز کے شیفتہ اور ایرانی تقلید کے فریفتہ ابتک اس طرز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مگر زمانے کی رفتار کو کون روک سکتا ہے۔ یہ بات ترکی ادباء و شعراء کی خاص ذہانت اور قابلیت کی تھی کہ اُنہوں نے اپنے مذاق میں مغربی لٹریچر کی نقل اتاری جس نے اُن کو ترکی کے پرانے پیچیدہ راستوں سے نکال کر ایک نہایت صاف و ہموار شاہراہ پر لگا دیا ہے۔ اس تغیر اور انقلاب میں زیادہ تر فرنچ زبان کی خوبیوں نے اپنا اثر ظاہر کیا اور پیرس شیراز کا قایم مقام بن گیا لیکن ابھی ترکی لٹریچر اور شاعری میں ایک اور ضروری عنصر شریک ہونے کو باقی تھا اس کی ابتدا سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہٗ و اقبالہٗ کے عہد میں ہوئی۔ اور جیسے آپ کے عہد میں علوم و صنائع نے ممالک عثمانیہ میں غیر معمولی ترقی حاصل کی اور تمدن کے ہر شعبہ میں ایک نئی ترقی نمودار ہوئی ویسے

ہی ترکی لٹریچر اور شاعری میں ایک جدید عنصر کا اضافہ ہوا یا یوں کہو کہ غم کی جگہ خوشی نے حاصل کی اور آرزو نے مایوسی کی جگہ دخل پایا اسکی تفصیل یہ ہے کہ اب سے بیس برس پہلے قسطنطنیہ کے ہر گلی کوچہ میں پیرس کے نازک خیال اور لطیف طبع لوگوں کی زبان سنائی دیتی تھی۔ آج اسی طرح دوکان دوکان پر مستعد اور جفاکش اور نازک خیالی کو چھوڑ کر عملی جد وجہد کو مقدم سمجھنے والے بہادروں اور اعلیٰ درجہ کے صناعوں۔ تاجروں سائنٹیفک ماہروں ہر علم وفن میں کمال رکھنے والوں اور بے نظیر سپاہیوں کی قوم (یعنی قوم جرمن) کی زبان بولی اور سنی جاتی ہے۔

سلطان محمود جنت آشیان نے قوم کو اس کی مخالفت کے باوجود پستی وتنزل سے نکلنے اور ترقی کرنیکے وسائل سے آگاہ کیا اور نئی وزارت کی بنیادیں تیار کیں اسکے بیٹے کے عہد میں دور اندیش وزرا نے اس عمارت کو اور بڑھایا اور چونکہ فرانسیسیوں کی زبان اور خیالات موجودہ ضروریات کے جمیع لوازم کو ساتھ لئے ہونے کے علاوہ بہت کچھ ایشیائی مذاق سے مشابہت رکھتے تھے اسکو اپنی قوم کی عام تعلیم کے لئے اس قوم کا شاگرد رشید بنا دیا ہے جس کی دنیا کے ہر میدان میں حیرت انگیز ترقی دیکھی جاتی ہے۔

فرانسیسی رنگ نمایاں طور پر جن ترکی مصنفوں کی تحریروں میں پہلے پہل دکھائی دیا وہ عاکف اور رشید پاشا ہیں لیکن اصلاح کے اس ابتدائی مرحلہ کو کمال تک پہنچانے کا فخر شناسی آفندی کو حاصل ہوا ہے جو ۱۸۷۱ء میں فوت ہوئے۔ اس میدان میں کمال بک شاعر اکرم بک اور حامد بک نے شناسی کو بنظیر مدد دی۔ فرانسیسی مذاق کے غلبہ کے زمانہ میں ترکی شاعری کا رنگ وانداز اور ٹون کمال رقت انگیز اور اداسی بھرا ہوا تھا اور ترکی شاعر زیادہ تر مرجھائے ہوئے پھول ناکامیوں اور ہجوم افکار کے رنج و صدمات سے گھل گھل کر عنقریب آغوش لحد میں سونیوالی نازنین لڑکیوں اور دوسرے ایسے ہی رقت انگیز مضامین پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے جنکی شیریں مگر حزیں آلود نظموں کو پڑھکر

خود بخود یہ خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ ایک بہادر لیکن رحم دل قوم اپنے انجام کو قریب پہنچتا ہوا دیکھکر بعالم بے خبری و محویت بلا کسی قصد کے اس تصور سے اطمینان کر رہی ہے کہ تمام خوبصورت چیزوں کا انجام بھیانک موت ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ترکی قوم اور اُس کے شعراء کی خیالات اور تصورات کی اب یہ کیفیت نہیں رہ گئی۔ اب سے بیس سال پہلے پولیٹیکل اور تمدنی حالت ہی ایسی مایوسی بخش ہو رہی تھی کہ اگر جدید فرانسیسی مشاعری کی زنانہ نازک طبعی اور رقت انگیزی کا اثر بھی نہ ہوتا تو بھی خود بخود قوم اور اُس کے انشا پردازوں پر گرد و پیش کے حالات دیکھکر مایوسی کے طاری ہو جانے کے لئے کافی اسباب موجود تھے لیکن اب جرمنوں کے مردانہ لٹریچر کے اثر اور ذاتی استحکام و طاقتوری کے علم سے ترکی لٹریچر اور نظم میں پھر وہی شجاعانہ عزم و استقلال اور مردانہ شگفتگی۔ فاتحانہ امنگیں حب الوطنی کا جوش اور پیش قدمی و نصرت کی بالیدگی ٹپک رہی ہے جو فاتح شام و مصر و ایران عرب جانبازوں کی رجزوں سے ٹپکا کرتی تھی۔

ہم نے یہ خیالات تاریخ خاندان عثمانیہ سے اخذ کئے ہیں اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُردو نے ترکی سے زیادہ اپنی نشوونما کا اظہار کیا ہے۔ اور جو طاقتیں ترکی کو میسر ہوئیں اور میسر ہیں وہ اُردو کو میسر ہونے پر بھی اردو نے بہت بڑی ترقی ظاہر کی ہے۔

ترکی ایک محدود رقبہ میں بولی جاتی ہے اور ترکی بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں اُسکے مقابلہ میں اُردو کا قلمرو بہت زیادہ وسیع ہے اور دس کروڑ کی تعداد اردو بولنے والوں کی ہے اسی طرح خدا کے فضل سے ترکی کو سیکڑوں برس سے سلاطین عثمانیہ کے زیر سایہ ترقی کرنے کا موقع ملتا آتا ہے لیکن اردو نے شاہجہاں کے وقت میں سر نکالا اور اُس وقت سے ابتک اُس کو بادشاہی حمایت کا موقع نہیں ملا کیونکہ پہلے فارسی غالب تھی پھر انگریزی کا دور دورہ ہوا بایں ہمہ اُس نے خود اپنی نشوونما کی خود زور طاقتوں سے ایسی ترقی حاصل کی جو بہت کچھ قابل قدر ہے۔

اور جیسے ترکی کی شاعری اور ادب میں پہلے فرنچ کی روشنی نمایاں ہوئی اور اب جرمن کے برقی لیمپ شاعرانہ دماغ کو روشن کر رہے ہیں ویسے ہی اردو کو انگریزی لیمپوں کی تابناک روشنیوں نے بہت کچھ روشن کر دیا ہے اور انگریزی کے علاوہ ہر قسم کے مغربی خیالات و مقاصد کے اثر سے اردو کی شاعری اور لٹریچر میں مفید تحریک کے ساتھ لطافت خیال اور سلاست مقال کو نئے سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے اور ہندوستان کے اہل مطابع اور شاعر اور ادیب اور مترجم اردو کے خزانۂ ادب میں ہر قسم کے جواہر جمع کرنے میں مصروف ہیں۔

اسی طرح ترکی کے غزل اور قصیدہ کہنے والے شاعروں کے سامنے اُردو کے غزل اور قصیدہ کہنے والے شاعر پیش کئے جا سکتے ہیں جو کسی باب میں اُن سے کم نہیں اور اور انواع رزم و رزم اور رقت انگیزی و رجز نگاری کا مقابلہ میر انیس و میرزا دبیر کے کلام اور مراثی و سلام سے ہو سکتا ہے اور دونوں کے دلنشین اثرات میں اکثر مقامات پر اردو بازی لے جا سکتی ہے۔

ترکی میں مرثیہ لکھنے کا مذاق بہت کم ہے پھر بھی ترکی زبان میں جو مرثیے کسی بڑے نامور شخص کی تعزیت اور یادگار میں لکھے گئے ہیں وہ وہی عربی اور فارسی کے محدود طرز کلام کا نمونہ ہیں جس میں چند شعروں سے زیادہ ترکی نے اپنا زور کلام دکھانے کو کوئی وسیع جادہ پیدا نہیں کیا اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر جو کام کر گئے وہ خود اُن کی معنی آفریں طبیعتوں کا پیدا کیا ہوا وادی ہے جس کی مثال عربی فارسی ترکی کسی زبان میں نہیں ملتی اور ترکی نے کوئی ترقی ایسی نہیں کی جس سے میر انیس اور میرزا دبیر کی شاعری مقابلہ نہ کر سکے۔ یا زور کلام اردو کے دوسرے سخن طراز دل کی تصنیف میں نہ پایا جاوے۔

ارباب سنت والجماعت پر مرثیہ کا اثر

موسیقی کا عام اثر یہ ہے کہ جب کوئی کثرت سے گانا بجانا سنتا ہے تو وہ کن رسیا ہو جاتا ہے اور اس میں آپ سے تال، سُر، سم۔ لے پہچاننے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور اُس کے اندرونی جذبات گانے کے ساتھ ساتھ اُسکے دل میں ایک باقاعدہ جنبش پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر نظم کو کثرت سے پڑھا اور سُنا جائے تو طبیعت میں ایک خاص موزونی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً آپ شاہنامہ پڑھنے کی عادت ڈالیں تو بعد چندے آپ کی طبیعت میں ایک خاص روانی پیدا ہو جائے گی جو اس سے پہلے نہ تھی ایسے ہی کثرت سے مرثیوں کا پڑھنا اور سُننا اندرونی جذبات کو ابھارتا اور طبیعت کو موزوں بننے کی رہبری کرتا ہے اور لطافتِ کلام کی خوبیاں اُس موزونیت کے ساتھ ساتھ اس میں نقادی کی قابلیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اور حسنِ کلام کے جلوے اُس کے مذاق میں اور اک کی قوت کو بڑھا دیتے ہیں۔

میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے وہ عجیب اثر ظاہر کیا ہے جو امام علیہ السلام کے واقعہ شہادت سے زیادہ عام دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس پچاس ساٹھ برس میں لاکھوں آدمیوں نے بلا قید مذہب اُنکے کلام سے دلچسپی ظاہر کی اور پورے شوق سے اُن کی مجلسوں میں شریک ہوئے ہیں راقم نے لکھنؤ الہ آباد عظیم آباد۔ حیدر آباد میں ہزاروں سنیوں کو اُن کی مجالس میں شریک دیکھا جس میں بڑے بڑے صاحب علم و ادب لوگ تھے اور سُنّی تو سُنّی ہزاروں ہندوؤں کو انکا گرویدہ پایا۔ اور آج تک وہ سلسلہ قایم ہے۔ یعنی ہزاروں آدمی بجائے حصول ثواب کے اُنکے کلام یا اُنکے باقیات الصالحات کے انداز بیان کے سننے کو جمع ہوتے ہیں اور مرثیوں کے رنگنے وہ عام دلچسپی اور دلنشینی حاصل کی ہے کہ ہر مذہب کے لوگ

اپنے پیشواؤں کے اوصاف اور انکی شجاعت اور شہادت کے کارناموں اور اُن کے مصائب کے اظہار کو مرثیوں کا رنگ کاٹنے لگے ہیں۔ اور زمانہ حال کی نظمیں بھی مرثیت کے رنگ میں رنگی جانے لگی ہیں۔ چنانچہ جناب مولوی فاروقی صاحب نے جو مولانا شبلی نعمانی کے اُستاد ہیں اور فلسفہ و ادب کے زبردست ماہر مانے جاتے ہیں اعلیٰ حضرت سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہٗ فرمانروائے ترکی کی فتح یونان کی ادائے تنبیت اور بہادر ترکوں کے اظہار شجاعت کو مرثیہ ہی کا رنگ قبول کیا ہے۔ اور مولوی محب حسین صاحب مترجم انگریزی ملازم سرکار نظام حیدرآباد نے حضرت خلیفہ دوم کی شہادت کا واقعہ اور اُن کے دوسرے اوصاف کے بیان کرنے کو مرثیہ ہی کی شان پسند کی ہے۔ میں ان دونوں تصنیفوں کے ابتدائی بند نقل کرونگا جس سے معلوم ہوگا کہ مرثیت کی شان نے ارباب سنت والجماعت کے شاعرانہ مذاق پر کیسا اثر ڈالا ہے۔

لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ حضرات خلفاء کے واقعات رحلت ایسے پُراثر نہیں جیسے امام حسینؓ کے واقعات ہیں اس لئے کہ اُنمیں تمدن اور فتوح کی کامیڈی ٹریجیڈی کا اثر ظاہر ہونے نہیں دیتی اور اہل بیت رسالت کے تمام واقعات درد و مصائب میں ڈوبے ہوئے ہیں جن کے نظم کرنیکے ساتھ ٹریجیڈی کا اثر شریک ہوتا ہے اور وہ اثر تمام اثروں پر غالب آجاتا ہے۔

مسدس فتح یونان کا مطلع

تصنیف علامہ الادب مولوی محمد فاروقی صاحب چڑیاکوٹی

سب دینوں میں ہے شمع ہدیٰ دین محمدؐ	اور راہبر راہِ خدا دین محمدؐ
آفاق میں ہے ظلِ ہما دین محمدؐ	اور مامن ہر شاہ و گدا دین محمدؐ

کیا ڈر ہے اُسے جس پہ ہو اسلام کا سایہ
یہ دین ہے اللہ کے انعام کا سایہ

مطلع مسدس

تصنیف مولوی محب حسین صاحب ملازم سرکار نظام حیدرآباد

ہے ذوالفقارِ حیدرِ صفدر قلم مرا — بر پا ہے کارزارِ سخن میں علم مرا
منشی چرخ دیکھے تو جاہ و حشم مرا — بھرتا ہی ہر فصیح فصاحت میں دم مرا

مداحی عترتؑ کا مجھے افتخار ہے
برتر فلک سے بھی مرا عزّ و وقار ہے

ان کے علاوہ اس زمانہ کے علامۃ الادب مولانا شبلی نعمانی نے ایک مستقل کتاب "موازنہ انیس و دبیر" میں اپنی دلچسپی کا قابل قدر ثبوت دیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ میر انیس کی مرثیہ گوئی نے دل پر کیسا گہرا اثر ڈالا ہے جس نے اُن سے ایسی مستقل کتاب لکھوا ڈالی۔

ہندوؤں پر مرثیہ کا اثر

بادشاہی زمانے میں لکھنؤ دلی کے بعد دوسرا شہر تھا جس نے اپنی تراش خراش اور ہر قسم کی نفاست اور لطافت میں اپنے آپ کو روشناس آفاق کر رکھا تھا اور چونکہ وہاں کے حکمرانوں کا مذہب شیعہ تھا اس لئے تعزیہ داری و مرثیہ خوانی کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی اور دربار شاہی کے حسن اخلاق اور طرز معاشرت نے ہر فرقہ اور ہر مذہب میں اپنا اثر

لہ یہ مرثیہ رسالہ دبدبۂ آصفی نمبر ۱۲ جلد ۹ میں طبع ہوا ہے ۱۲

پیدا کیا جو پچاس برس کے قریب زمانہ گزرنے پر آج تک نظر آرہا ہے یعنی لکھنؤ کے ہزاروں ہندو تعزیہ بناتے مجلسیں کرتے اور مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے اُنکے قلوب پر ایسا گہرا اثر کیا ہے کہ وہ اُس مذاق سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض خوش طبع ہندوؤں نے مرثیے کی وضع میں نظمیں لکھنا شروع کر دی ہیں چنانچہ لکھنؤ سے ایک نظم الاخبار جاری ہوا تھا جو بالکل نظم میں لکھا جاتا تھا۔

وہ کئی برس جاری رہا اُسکے ناظموں میں تمنا واثق نے زیادہ نظمیں لکھیں وہ اکثر مرثیوں کے طرز کی تھیں۔ اور اب بھی یہ دونوں صاحب جو ہندو پارٹی کے لیڈر ہیں اپنے مذہبی اور قومی خیالات اُسی رنگ میں ادا کرتے رہتے ہیں۔ اُن نظموں کو مسلمان بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اُن کے علاوہ میں نے کانپور کے ماہواری رسالہ زمانہ میں جو اُردو کی نظم و نثر کا قابل قدر مخزن ہے۔ برج نرائن صاحب چکبست لکھنوی کی ایک نظم دیکھی جس میں رامائن کا ایک سین دکھایا گیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی قابل قدر صحبتوں نے عام دماغوں پر کیسا عجیب اثر کیا ہے۔ دخل کیا جو اُردو کے حسن کلام کے سوائے ہندوانہ قسم کے الفاظ جیسے ماتا وغیرہ کو داخل نظم کیا گیا ہو۔ یہ نظم مسدس کے طور پر لکھی گئی ہے اور میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کا رنگ بھرا ہے اس میں ہندوستان کے مشہور مقدس شہزادہ رامچندر کا وہ وقت دکھایا ہے جبکہ وہ ایک زمانہ دراز کے لئے جنگل کی بود و باش اختیار کرنے پر راضی ہوتے ہیں اور اُن کی مادر گرامی اُن کو سمجھاتی ہیں کہ ایسا نہ کرو۔ یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوگا لیکن سعادتمند شہزادہ اپنے محترم باپ کی بات کو پورا کرنے پر آمادہ ہے۔

میں اُن بندوں کو بجنسہٖ نقل کرتا ہوں۔ نقادان سخن دیکھیں کہ ان میں مرثیت کا کتنا گہرا رنگ ہے اور لکھنؤ کے ہندو سخن طراز نے اُسکو کس خوبی سے لکھا اور آداب کلام میں

فصاحت اُردو کا کیسا خیال رکھا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی سے اُس کو کیسی تحریری مشابہت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگواروں کے طرز بیان نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں پر کیسا اثر ڈالا ہے جو دوسری نوعیت سے حسن کلام بن کر دوسرے مذاق میں جلوہ گر ہوا ہے اور وہاں بھی اُس نے مذہبی خدمت کے سوائے دوسری خدمت پسند نہیں کی۔

یہانتک باغ سینچا باغباں نے خونِ بلبل سے — کہ آخر رنگ ہو کر پھوٹ نکلا عارضِ گل سے

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

آخر ہے کچھ حدِ ستم و ظلم و جور بھی
ہم کو اُداس دیکھ کے غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بیگناہ — نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا — افسانۂ شدآمدِ رنج و محن کھلا

اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
واتھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگِ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑی کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن ہیں اپنے مُنہ سے نہ ہرگز کہونگی ہاں

کس طرح بن میں آنکھ موندکے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیجدوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید

لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم تُو
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

میں خوش ہوں پھونک دی کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں میں گذاری ہیں ماہ و سال
دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
لائے دُلہن جو بیاہ کے شادی ہوئی کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال

چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جنکے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کیواسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ ہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ

منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ

تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریادِ دردخیز
اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز

عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور

مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
ہونا جو ہے سب اُسکے بہانے ہیں سر بسر

اسبابِ ظاہری ہیں نہاں پردۂ نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر

خاص اُس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار

تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار

سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں

دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھکے زمانے نے انقلاب
جن سے کہ بیگناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے خراب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب

کچھ بن نہیں پڑا جو مصیبت بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جنکا ہر گھڑی
قایم تھیں جنکے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑکر نہیں پڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہر کبریا کی شان اگر رتے ہی ماہ و سال
خود دل سے درد ہجر کا مٹ گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اُس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گنہگار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قایم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم نہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں

رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بیشمار
موقوف کچھ ریاض پہ اُنکی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و برف و باد میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سو بندوں کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

برج نرائن چکبست لکھنوی

رباعی

اصنافِ سخن میں رباعی، نہایت پُرلطف و بکار آمد چیز ہے یہ ایسا سانچہ ہے جس میں فلسفہ، حکمت و اخلاق، نصائح و معرفت کے بڑے بڑے اصول چار مصرعوں میں سما جاتے ہیں کوئی رباعی روزمرہ اور محاورہ کے انمول موتی اپنے دامن میں بھرے ہوتی ہے جو فنِ ادب کا قیمتی جوہر ہوتے ہیں۔ رباعی کی ایجاد کا فخر عرب کو حاصل ہے اُس کے بعد فارسی میں اُس کی تقلید کی گئی اور فارسی رباعیوں میں بڑے بڑے معنی خیز مطالب اور فلسفہ و حکمت کے مسائل بیان کئے گئے از انجملہ عمر خیام کی رباعیاں مشہور

آفاق ہیں۔ یورپ میں بھی اُن کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے بلکہ انگلستان میں ایک خاص کلب عمر خیام کے نام سے قایم ہے جہاں تاریخ مقررہ پر علم و فن کے بڑے بڑے نقاد جمع ہوتے ہیں۔ پھر اُردو میں اُس کی نقل کی گئی۔ ہر چند اردو کے سخن طرازوں نے تصنیف رباعیات پر زیادہ توجہ نہیں کی جس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص اُسکے اوزان اور ضبط کلام پر قادر بھی نہیں ہو سکتا اسی لئے یہ حصہ زیادہ تر میر انیس اور میرزا دبیر جیسے معنی آفرینوں کے حصہ میں آیا اور اُنھوں نے رباعیوں میں بھی ایک نئی روح پھونک دی اور اُردو کے قالب میں نئی جان ڈالدی۔

منشی رحمت اللہ صاحب رعد کانپوری نے جنکا مطبع حسن و لطافت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اور مولانا روم کی مثنوی اور حافظ شیراز کے دیوان کو انھوں نے بے انتہا خوشنمائی کے ساتھ چھاپا ہے اُسی طرح میر انیس مغفور کی رباعیاں جمع کر کے زیور طبع سے آراستہ کی ہیں۔ میں ذیل میں میر انیس کی چند رباعیاں نقل کرتا ہوں جو اُردو کا سرمایۂ ناز اور حُسن مقابل کا خلاصہ امتیاز ہیں۔

رباعیات میر انیس مغفور

معرفت الٰہی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک کہ گب جاں سے ہے اُسپر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

نعت

دنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں
کس راز سے یہ خلق کے آگاہ نہیں
باریک ہے ذکر قربِ معراجِ رسولؐ
خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

خیالِ آخرت

اب خواب سے چونک وقتِ بیداری ہے
لے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک
یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

روح و تن کا فراق

جس دن کہ فراقِ روح و تن ہیں ہوگا
مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت نو پہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

قبر

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں القبر
میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

لوازم درجات

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لئے
جرات واجب ہے بےکلاہی کے لئے
لازم ہے کہ ہو اہلِ سخن تیز زباں
تلوار ضرور ہے سپاہی کے لئے

حاسد

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے
کب تھمتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ ترے سخن کی تاثیر انیس
رو دیتے ہیں مثلِ شمع جلنے والے

دنیا کی حالت

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے
مانندِ حباب ہستی انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد
سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

زندگی

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے
جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب
غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

تلازمۂ شراب

ایک ایک قدم لغزشِ مستانہ ہے
گلزارِ بہشت اپنا میخانہ ہے

سرمست ہیں حبِ ساقیِ کوثر سے
آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہے

قبر کی تنہائی

خاموشی میں یاں لذتِ گویائی ہے
آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے

نے دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

بڑھاپا

ہشیار کہ وقت سازِ برگ آیا ہے
ہنگامِ یخ و برف و تگرگ آیا ہے

محتاجِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلیے اب چوب دارِ مرگ آیا ہے

خاکِ لحد

کانوں میں سدا حرفِ پریشانی ہے
دیکھا جدھر آنکھ اٹھا کے ویرانی ہے

مشہور علاجِ دردِ سر ہے صندل
یاں خاکِ لحد صندلِ پیشانی ہے

قدرتِ باری

ہر برگ سے قدرتِ احد پیدا ہے
ہر پھول سے صنعتِ صمد پیدا ہے

سینہ ہے بشر کا وہ محیطِ[۵۱] ذخار
ہر ایک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

حالتِ زمانہ

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا
کیوں چرخِ کہن نیا یہ کیسا دور ہوا

گردش کبتک نکل چلو جلد انیس
اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

سخن جان ہے

انسان ذی عقل و ہوش ہو جاتا ہے
اور صاحبِ چشم و گوش ہو جاتا ہے

گر جان نہیں سخن تو بتلائیے پھر
کیوں مر کے بشر خموش ہو جاتا ہے

[۵۱] محیط ذخار دریائے اعظم ۱۲ جزر و مد جوار بھاٹا ۱۲

اوج منزلت

بالیدہ ہوں وہ اوج سے مجھے آج ملا
ظلِ علمِ صاحبِ معراج ملا
ممبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم
اب چاہیے کیا تخت ملا تاج ملا

انجام دنیا

غافل تجھے کیوں خواہشِ دنیا دوں ہے
پیوند زمیں ہر کوئی درویش و غنی ہے
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ
سوتے ہیں تہِ خاک گلے میں کفنی ہے

معرفت

گلشن میں پھروں کہ سیر دریا دیکھوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

رحمت باری

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

دیگر

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری
حسنِ خلق و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیاں میرے
دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

حالت زندگی

گو صورتِ دریا ہمہ تن جوش ہوں میں
لب خشک ہیں چشم تر ہے خاموش ہوں میں
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا
مانندِ حباب خانہ بردوش ہوں میں

خودداری

عزت رہے یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں انیسؔ
یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

خوفِ الٰہی

ہر دم ہے خیالِ عذر خواہی دل میں
مطلق نہیں کچھ خوفِ الٰہی دل میں

ناٹے کی طرح خطا میں گذری سب عمر
بالوں پہ سپیدی ہے سیاہی دل میں

دادِ سخن

نافہم سے کب دادِ سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سُن لیتا ہوں

چھپتی نہیں بوئے دوستانِ یکرنگ
کانٹوں کو مٹا کے پھول چن لیتا ہوں

باغِ ہستی

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے

تھا کون سا گل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

نغمہ سنجی

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں
خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں

میں باعثِ نغمہ سنجیٔ بلبل ہوں
کھولے نہ کبھی مُنہ جو زباں بند کروں

نقشِ سخن

مضمونِ انیس کا نہ چہرا اترا
اترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشا اترا

نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی
تصویر نہ کھنچ سکی تو چہرا اترا

مجموعہ خاطر

مجموعہ خاطران دنوں ابتر ہے
جو رگ ہے بدن پہ رشتۂ مسطر ہے

معنی سے بھرا ہوا ہے دل شکل کتاب
کیا غم ہے جو تن مثلِ قلم لاغر ہے

غرور

اتنا نہ غرور کر کہ مرنا ہے تجھے
آرام ابھی قبر میں کرنا ہے تجھے

رکھ خاک پہ سوچ سوچ کے پاؤں انیسؔ
اک روز صراط سے گذرنا ہے تجھے

گوشہ نشینی

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا
برسوں نہ کبھی روزِ فراغت دیکھا
راحت کا مکاں امن کا گھر خانہ عشق
دیکھا تو جہاں میں کنجِ عزلت دیکھا

بڑھاپا

پیری آئی عذار بے نور ہوئے
یارانِ شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیسؔ
جو مشک سے بال تھے وہ کافور ہوئے

ترکِ وطن

اب ہند کی ظلمت سے نکلتا ہوں میں
توفیق رفیق ہو تو حلیتا ہوں میں
تقدیر نے بیڑیاں تو کاٹی ہیں انیسؔ
کیوں رک گئے پاؤں ہاتھ ملتا ہوں میں

انجام کا خیال

غفلت میں نہ عمر کو بسر کر
انجام پہ اک ذرا نظر کر
اس طولِ عمل سے فائدہ کیا
کل کوچ ہے قصہ مختصر کر

موت

اب گرمِ خبر موت کے آنے کی ہے
نادان تجھے فکر اب روانے کی ہے
ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا
آنا تیرا دلیل جانے کی ہے

دل

ہے مملکتِ جسم میں شاہی دل کی
کچھ تو نے نہ دوستی نباہی دل کی
بعد اس کے دعائے موسپیدی کرنا
پہلے دہولے ذرا سیاہی دل کی

ناراستی

کس بات میں کید کس میں تزویر نہیں
جز حرف غلط زباں پہ تقریر نہیں
اس عہد میں راستی کا کیونکر ہو رواج
مسطر کج ہے قلم کی تقصیر نہیں

خودستائی

کیوں زر کی ہوس میں آبرو دیتا ہے
لازم نہیں اپنے منہ سے تعریف انیس

ناداں یہ کسے فریب تو دیتا ہے
خالص جو ہے مشک آپ ہو دیتا ہے

فروتنی

رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی

وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

زندگانی

دو دن کی حیات پر عبث غرہ ہے
ہر وقت نہال زندگانی کے لئے

خورشید نہ بن خاک کا تو ذرہ ہے
یہ آمد و شد نفس کی بھی ارہ ہے

آرام قبر

فردوس ہر اک قبر کا کونا ہوگا
راحت دنیا میں غیر ممکن ہے انیس

مخمل ہیں خاک کا بچھونا ہوگا
آرام سے ہاں لحد میں سونا ہوگا

نرمی

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگدل ہوتے ہیں

جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
دندانِ صعف بستہ ہیں زباں کے آگے

دزدانِ مضامین

کب دزد سے دولتِ ہنر بچتی ہے
ممکن نہیں دزدانِ مضامیں سے نجات

لے بھاگتے ہیں جبکہ نظر بچتی ہے
سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

شیریں کلامی

نے مدح کا دعویٰ ہے نہ خود بینی ہے
شیرینی میں ہے نمک حلاوت دیکھو

باتوں میں اثر زباں میں رنگینی ہے
ہے طرفہ مزا نمک میں شیرینی ہے

مشک آنست کہ خود ببوید

کس مُنہ سے کہوں لائق تحسین ہوں میں
کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر
کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہوں میں

بینائے سخن

مضمون گوہر ہیں اور صدف سینہ ہے
ہے صاف تو یہ کہ قلب آئینہ ہے
آئینہ سے روشن ہے کمال اپنا انیسؔ
ہم اُس کو نظر آئیں گے جو بینا ہے

معرفت

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

انسان

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
ادنیٰ کے لئے مقام اعلا بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں
اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

دولت فقر

یہ اوج یہ مرتبے ہما کو نہ ملے
یہ دلق مرقع امرا کو نہ ملے
بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولتِ فقر
برسوں ڈھونڈے تو بادشاہ کو نہ ملے

خیال عاقبت

دل بُت سے اُٹھا کے حق پرستی کیجے
بے تیغ انیسؔ قطع ہستی کیجے
آخر اک دن یہ پاؤں ہوں گے بیکار
بہتر ہے یہی کہ پیشدستی کیجے

خاکساری

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے
غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرہ
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

توشۂ آخرت

گر لاکھ برس جیئے تو پھر مرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے

پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

روداد قبر

راحت میں بسر ہوئی کہ ایذا گزری
اے کنج لحد کے سونے والو افسوس

کیوں کر تاریک گھر میں تنہا گزری
کس سے پوچھیں کہ تم پہ کیا کیا گزری

بند اجل

کچھ عقل کی میزان میں تولا نہ گیا
عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس

چپ ہو گئے اس طرح کہ بولا نہ گیا
یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا

دنیا میں آنا

کیا سوچ کے اس دار فنا میں آئے
اس طرح عدم سے آئے دنیا میں انیس

آفت میں پھنسے دام بلا میں آئے
جیسے کوئی کارواں سرا میں آئے

سامان حسرت

وہ تخت کدھر ہیں اور کہاں تاج ہیں وہ
قرآن لکھ لکھ کے وقف جو کرتے تھے

جو اوج پہ تھے زیر زمیں آج ہیں وہ
اک سورۂ الحمد کے محتاج ہیں وہ

اعمال حسنہ

کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ

دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

وقت مرگ

اب زیر قدم لحد کا باب آ پہنچا
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی آہ انیس

ہشیار ہو جلد وقت خواب آ پہنچا
ہنگام غروب آفتاب آ پہنچا

جوانی و پیری

یہ عمر یوں ہی تمام ہو جائیگی
مرنے کی خبر بھی عام ہو جائے گی

روتے ہو انیسؔ کیا جوانی کے لئے
پیری کی سحر بھی شام ہو جائے گی

قافلہ ہستی

آلودہ عبث اس غم جانکاہ میں ہے
زندہ ہے وہ دل جو یاد اللہ میں ہے

اپنی واماندگی سے گھبرا نہ انیسؔ
پہنچا کوئی منزل پہ کوئی راہ میں ہے

بے لطف زندگی

کیا حال کہیں دل کی پریشانی کا
کھانے کی نہ لذت نہ مزا پانی کا

مر رہیے کسی دشت کے دامن میں انیسؔ
پردہ ہے یہی جامۂ عریانی کا

دام دنیا

دنیا کو نہ جانو کہ دل آرام ہے یہ
اے پختہ مزاجو طمع خام ہے یہ

ہاں سوچ کے پانوں اس زمیں پر رکھو
چھٹتا نہیں جس میں پھنسے وہ دام ہے یہ

ہوسنالی

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے
جانا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے

اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پانوں تو سر پھرتا ہے

اپنی نسبت

کس دن فرس خامہ تگ و دو میں نہیں
مجھ سا بھی سیہ بخت کوئی سو میں نہیں

ہر چند کہ ہوں خسرو اقلیم سخن
پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں

چاہ دنیا

راحت کا مزا اعدوے جانی نکلا
دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا

پیاسے رہے آکے چاہ دنیا پہ انیسؔ
نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

معرفت

سایہ سے بھی وحشت ہو وہ دیوانہ ہوں
جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اُس کا عاشق ہوں انیسؔ
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

قدر اشک

مجلس میں عجب بہار چشم تر ہے
ہر لخت جگر رشک گل احمر ہے
اشکوں سے ہو کیوں نہ آبرو آنکھوں کی
بیقدر ہے وہ صدف جو بے گوہر ہے

غزل گوئی

عربی اور فارسی میں شاعری کا بہت بڑا حصہ تغزل سے بھرا ہوا ہے فارسی میں سیکڑوں دیوان غزلیات کا مجموعہ ہیں۔ اور اُردو نے بھی غزلیات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ غزل میں ایک مطلع ہوتا ہے اور باقی تمام اشعار اُسی ردیف و قافیہ یا صرف قافیہ کی پابندی سے کہے جاتے ہیں اور کم سے کم پانچ اور بدرجۂ اوسط پندرہ بیس شعر کی غزل ہوتی ہے اور ہر شعر کا مطلب جدا ہوتا اور اُسی شعر پر تمام ہو جاتا ہے بعض اشعار قطعہ بند بھی آپڑتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ میر انیس کی شاعری میں غزلیات کا پتہ نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اُنکے سیکڑوں سلاموں سے غزلیات کا مجموعہ فراہم ہو سکتا ہے چنانچہ میں چند سلاموں سے اُنکے اشعار منتخب کر کے یہ گلدستہ آپکی نذر کرتا ہوں۔

غزلیات از کلام میر انیس

ہماری آنکھ میں آنسو ہیں یا دریا چھلکتا ہے
جگر میں داغ ہیں یا کھیت لالے کا لہکتا ہے
دمِ تحریر گلریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پر
صریر کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے

انیسؔ اللہ تجھ پر سہل کر دے قبر کی منزل
لحد کا وہ سیان جب آتا ہے کیا کیا دل دہلتا ہے

دیگر

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

ہر اک کے ساتھ ہر روشن دلو طلوع و غروب
سحر کو چاند نہ تھا شب کو آفتاب نہ تھا

انیسؔ عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلام ابوتراب نہ تھا

دیگر

کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

کسی کو کیا دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹتے ہیں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

قناعت و گہر آبرو دولت و دیں
ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت کے
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

مسافر شب اول بہت ہے تیرہ و تار
چراغ قبر ابھی سے جلا نہیں رکھتے

وہ لوگ کون سے ہیں ایخدائے کون و مکاں
سخن کو کان سے جو آشنا نہیں رکھتے

انیسؔ بیچ کے جاں اپنی ہند سے نکلو
جو توشۂ سفر کربلا نہیں رکھتے

دیگر

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اڑ گیا جب رنگ رخ سے استخواں پیدا ہوئے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

جو علم سے آگیا دنیا میں بولی ہنس کے موت
اور لو دو چار دن کے مہماں پیدا ہوئے

ضبط دیکھو سب کی سُن لی پر نہ کچھ اپنی کہی
اس زباندانی پہ گویا بیزباں پیدا ہوئے

ایک بیک ایسا زمانہ میں ہوا ہے انقلاب
قدرداں سب اُٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

احتیاط جسم کیا انجام کو سوچو انیسؔ
خاک ہونے کو یہ مشتِ استخواں پیدا ہوئے

دیگر

جز پنجتن کسی کی تولا نہ چاہیے
غیر از خدا کسی کا بھروسا نہ چاہیے

اک در پہ بیٹھ کر ہے توکل کریم پر
اللہ کے فقیر کو پھیرا نہ چاہیے

راحت خدا نے دی تو کیا تو نے شکر کب
ایذا بھی چار دن ہو تو شکوا نہ چاہیے

ہر کوہ پر نہ ہوگی تجلی مثالِ طور
ہر ہاتھ کے لئے یدِ بیضا نہ چاہیے

کھانے کو رزق رہنے کو گھر اور لحد کو جا
دنیا میں ایک جان کو کیا کیا نہ چاہیے

مرقد چراغِ داغ سے روشن رہا انیسؔ
شب کو اکیلے گھر میں اندھیرا نہ چاہیے

دیگر

زرد ہے چہرہ نحیف و زار ہوں
اے مسیحائے زماں بیمار ہوں

مثلِ بوئے گل سفر ہوگا مرا
وہ نہیں میں جو کسی پر بار ہوں

بلبلیں دم بھر جدا ہوتی نہیں
کس گلِ تر کے گلے کا ہار ہوں

عالمِ پیری میں آئے کون پاس
اے عصا گرتی ہوئی دیوار ہوں

ہر کس و ناکس سے جھکنے کا نہیں
ہمدموں میں تیغِ جوہر دار ہوں

سوکھ کر کانٹا ہوا ہوں اے انیسؔ
آنکھ میں دشمن کی اب تک خار ہوں

دیگر

کچھ اور جز سخن نہیں اہلِ سخن کے پاس
مجرائی کیا زباں کی سوا ہے دہن کے پاس

دیگر

ضبط گریہ ماتمِ سرور میں ہو سکتا نہیں
سر جھکا کر بیٹھ محفل میں جو رو سکتا نہیں

رات اندھیری پرسشِ اعمالِ ایذائے فشار
قبر میں بھی چین سے انسان سو سکتا نہیں

کارزاتی میں ہیں عاجز کارسازانِ جہاں
گرد اپنے مُنہ کے پانی آپ دھو سکتا نہیں

نظم ہے یہ یا درِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

دیگر

مرا رازِ دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جُدا جسکا ہے سب سے رنگ
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جسمیں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت زال دنیا نے دیں بازیاں
میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

جہنم سے ہم بقیراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھیرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب ہوگئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

دیگر

واقف خمارِ غم سے نہیں دل فقیر کا
پیمانہ کش ہوں بادۂ خمِ غدیر کا

اثنا عشر کے گھر کا گدا ہوں بتا یہ ہے
بارہ دری میں رہتا ہے بستر فقیر کا

اے باغباں میں بلبلِ گلزارِ قدس ہوں
سدرہ پہ آشیاں ہے مرے ہمصفیر کا

پوچھے کوئی پتہ تو یہ کہہ دیجیو انیسؔ
ہے وادی السلام میں بستر فقیر کا

دیگر

خیالِ چہرۂ شہ وقتِ خواب رہتا ہے
تمام شب مرے گھر آفتاب رہتا ہے

بشر کی ریش میں جبتک خضاب رہتا ہے
اگر رہا تو بس اتنا شباب رہتا ہے

ہمارے شیشۂ دل کو نہ توڑیو ہرگز
یہ ظرف وہ ہے کہ جس میں گلاب رہتا ہے

جو دل جلے ہیں انہیں کا سخن ہے گرما گرم
مزا ہے سیخ پہ جب تک کباب رہتا ہے

لگا کے آتش قلب و جگر کو اشک نکل
دوا تشنہ ہو تو برسوں گلاب رہتا ہے

بھری ہے کونسی یارب دلِ انیسؔ میں آگ
کہ جسکی آگ سے دوزخ کباب رہتا ہے

دیگر

ساتھ جاتا نہیں کچھ جز عملِ نیک انیسؔ
اس پہ انسان کو ہے خواہشِ دنیا کیا کیا

دیگر

گھٹا زورِ مشقِ سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

نواسنجیوں نے تری اے انیسؔ
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

دیگر

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعف پیری سے
چنا ہے جامہ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

یہ غل تھا مہر نبوت پہ جب چڑھے حسنینؑ
جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

مزا یہ طرفہ ہے مضمون دستیاب نہیں
مقابلہ پہ چڑھائے ہیں آستینوں کو

غلط یہ لفظ وہ بندش بری یہ مضمون سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

دہانِ کیسۂ زر بند کر یہ اے منعم
خدا کیواسطے وا کر جبیں کی چینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

دیگر

خدا کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا
اُسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا

قریب قبر ہم آئے کہاں کہاں پھر کر
تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دیگر

ہوا جو عشق ثنائے ابوتراب مجھے
خدا نے کر دیا ذرّے سے آفتاب مجھے

خزانۂ گہر بے بہا تھا پردوں میں
دکھائے چشم نے کیا کیا درخوش آب مجھے

کبھی نہ دوں عرق روئے شاہ سے نسبت
ہزار طرح سے چھینٹے جو دے گلاب مجھے

چھلکتے جام رہیں میکدہ رہے آباد
خم غدیر کی دے ساقیا شراب مجھے

دیگر

نمود بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

ارے نہ آئیو دنیائے دوں کے دھوکے میں
سراب ہے یہ جسے موج آب سمجھے ہیں

شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیروں کو
سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

دیگر

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچا تا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے

قطع امید ایک در سے گر ہوئی کچھ غم نہیں
اور کچھ سامان کر دیگا خدا میرے لئے

ہر نفس آئینہ دل سے یہ آتی ہے صدا
خاک تو ہو جا تو حاصل ہو جلا میرے لئے

اے مہوس اپنی اپنی قسمت ازکار رشک کیا
کیمیا تیرے لئے خاک شفا میرے لئے

خاک سے ہو خاک کو الفت تڑپتا ہوں انیسؔ		کربلا کے واسطے میں کربلا میرے لئے

دیگر

رنج دنیا سے کبھی چشم اپنی نم رکھتے نہیں		جز غم آلِ عبا ہم اور غم رکھتے نہیں
در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے		سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں
دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے انکے سر		آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں
جو سخی ہیں مالِ دنیا سے ہیں خالی انکے ہاتھ		اہلِ دولت جو ہیں وہ دستِ کرم رکھتے نہیں
زور سے اسکے لیا ہے ہم نے میدانِ سخن		اور نیزہ ہاتھ میں غیر از قلم رکھتے نہیں
یہ دوات و خامہ ہے ملکِ فصاحت کا نشاں		کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم رکھتے نہیں

قصیدہ

قصیدہ غزل کی طرح مطلع کے ردیف و قافیہ یا صرف قافیہ کی پابندی سے لکھا جاتا ہے اور قصیدہ میں شعر زیادہ ہوتے ہیں اور ایک سلسلہ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قصیدہ کا درجہ غزل سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ غزل کا مقصد معشوق سے بات کرنا اور قصیدہ کا موضوع بادشاہ اور ممدوح سے عرض کلام ہوتا ہے اسی لئے دونوں کے اقسام ادب میں فرق ہونا لازمی ہے اور ہر مقام کے مناسب حال الفاظ اور حسن مقال کی خوبیوں کو دکھانا یہی ایک زباندان شاعر کا کمال ہے ہر کوہ نتابد ایں صدارا

قصیدہ میں تشبیب، گریز، مدح ممدوح یہ تین خاص طور سے دیکھے جاتے ہیں تشبیب میں لالہ و گل و ریحان و سنبل، جام و سبو ساقی و مطرب اور دوسرے حسن شباب کے لوازم کا بیان ہوتا ہے پھر ان سے گریز کر کے مدح پر توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ یہ مقام ایسا ہونا چاہئے جو تشبیب کے بعد سامعین کو شوق سے

مدح کے سننے پر آمادہ کردے۔ زاں بعد مدح اُن لفظوں میں ہونا چاہیئے جو اس درجہ کے لائق ہیں۔ اور اُن چیزوں کی مدح کرنا چاہیئے جو ممدوح کے ساتھ خاص نسبت رکھتی ہیں۔ سو یہ تینوں باتیں میر انیس کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میر انیس نے اپنے اکثر مرثیوں کے چہرے جس آب و تاب سے آراستہ کئے ہیں اُن میں تمام لوازم تشبیب کو دیکھ لیجئے جو اس بہتات سے کسی دیوان میں دیکھنے کو نہ ملیں گے۔ اور تشبیب کے بعد جس خوبصورتی سے اُنہوں نے مقام گریز کو ادا کیا ہے وہ بجائے خود دیکھنے کی چیز ہے۔ پھر ائمہ علیہم السلام کو دین و دنیا کا بادشاہ سمجھ کر جس شان و شکوہ سے مدح سرائی کی اور جو الفاظ ہر مقام کے مناسب درجہ و ادب صرف کئے وہ ایسے ہی درجہ شناس زبان آور کا حصہ ہو سکتے ہیں قصیدہ لکھنے والوں کو چاہیئے کہ اُن مقامات کے الفاظ اور اُن کی طرز ادا کو دیکھیں۔ سمجھیں اور اپنے قصائد میں اُن کا خیال رکھیں۔ اور مسدس کی جگہ قطعہ و قصیدہ کے لباس میں پیش کریں۔ میر صاحب کے کلام سے ایسے سیکڑوں مقام انتخاب ہو سکتے ہیں۔ میں اس مختصر میں کیا کیا لکھ سکتا ہوں۔

مثنوی

مثنوی کے ہر شعر کا ردیف و قافیہ جدا ہوتا ہے۔ البتہ ایک شعر سے دوسرے شعر کا سلسلہ قایم رکھنا ہوتا ہے۔ اور اصنافِ سخن میں مثنوی ایک بڑی بکار آمد چیز ثابت ہوئی ہے۔ اکثر شعراء نے مختلف مذاق میں مثنویاں لکھی ہیں۔ تصوف میں مولانا روم کی مثنوی مشہور آفاق ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ اور نظامی کا سکندر نامہ بھی مثنوی کی طرز پر لکھے گئے ہیں اور اکثر رزم و بزم اور حسن و عشق کے واقعات اور افسانے مثنوی

۔ کے رنگ میں ادا کئے گئے ہیں۔ اردو میں میر حسن کی مثنوی اور گلزار نسیم کو قبولیت عام اور شہرت تام حاصل ہے۔ آپ کہیں گے کہ میر انیس نے کوئی مثنوی نہیں لکھی لیکن میرے نزدیک یہ خیال ٹھیک نہ ہوگا۔ میرے نزدیک میر انیس کے ہزاروں مرثیوں سے سیکڑوں مثنویاں بن سکتی ہیں اور اگر آپ ایک بڑی مثنوی بنانا چاہیں تو اُن کے مرثیوں کو جمع کر کے اُن میں سے ایک بحر کے سب مرثئے نکال لیجئے پھر اُن مرثیوں کے ہر واقعہ کو مورخانہ طور پر ترتیب دیجئے جس سے ایک کے بعد دوسرے واقعہ کی داستان چسپاں ہوتی ہو پھر مسدس کے ہم قافیہ دو شعروں میں سے ایک شعر نکال دیجئے اور بعض مقامات پر اُس کو دوسری جگہ چسپاں کیجئے اس طور سے آپ ایک بڑی مثنوی متعدد واقعات کی بنا سکتے ہیں۔ میں اس مقام پر میر انیس کے ایک مرثیہ سے ایک مثنوی بنا کر بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ انصاف سے دیکھئے کہ میر صاحب کے کلام نے مسدس سے نکل کر مثنوی کے رنگ میں کیا حُسن ظاہر کیا ہے۔

جنگ نامہ میر انیس

حضرت قاسمؑ گلگوں قبا کی جنگ

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح
سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گذار صبح

تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہو جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ صبح نور اور وہ سبزہ وہ لالہ زار
کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں

ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

ادرجِ زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی
کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
نخل سی وہ گیاہ وہ گل سرخ و سبز و زرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

پیاسی جو تھی سپاہِ خداتین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

تھا لشکرِ یزید میں سامانِ قتلِ شاہ
ہر سو جمار ہا تھا صفیں شمر رو سیاہ

اک صف میں برچھیوں کی چمک تھی کہ الحذر
انیاں وہ توڑ ڈالیں جو فولاد کا جگر

جب بندھ چکیں صفیں تو علم کھل گئے تمام
غل پڑ گیا کہ جنگ کو نکلیں شہِ انام

سُن کر یہ غل محل سے برآمد ہوئے حضور
پڑھنے لگے درود رفیقانِ ذی شعور

حق کے ولی مصاحبِ سردارِ انس و جن
کوئی جواں کوئی متوسط کوئی مُسن

وہ گورے گورے جسم قبائیں وہ تنگ تنگ
زیور کی طرح جسم پہ زیبا سلاحِ جنگ

کہتے تھے سب چڑھائے ہوئی آستین کو
آقا ابھی کہیں تو اُلٹ دیں زمین کو

تھے اک طرف عزیزِ شہِ آسماں وقار
جانباز سر فروش بہادر وفا شعار

غازی تھے صف شکن تھے حریری تھے دلیر تھے
جس میں علیؑ رہے اُسی بیشہ کے شیر تھے

لشکر سے تب بڑھا پسرِ سعدِ چند گام
چلے میں رکھ کے تیر یہ سب سے کیا کلام

ہے شاق مجکو خلق میں حبِ حسینؑ کا
کیا شاد ہوں ہدف ہو جو سینہ حسینؑ کا

لکھا ہے جب لگا کے وہ ناوک بڑھا شریر
یکبار فوجِ شہ پہ چلے دس ہزار تیر

جس وقت خاتمہ رفقا کا ہوا بخیر
تھے پھر تو سب عزیز نہ تھا اُن میں کوئی غیر

رخصت ہوا حسینؑ سے پھر دلبرِ حسنؑ
برہم ہوئی وہ بزم وہ صحبت وہ انجمن

دولہا کے نورِ رخ کی ضیا چرخ تک گئی
جولاں کیا فرس کو تو بجلی چمک گئی

پہنچا جو رزم گاہ میں وہ غیرتِ قمر
نیزہ پکڑ کے گھوڑے کو پھیرا ادھر اُدھر

اللہ ری چمک رُخِ پر آب و تاب کی
سہرہ بنا ہوا تھا کرن آفتاب کی

ناگہ یہ رجز پڑھنے لگے قاسمِ جری
عالم میں کون ہے جو کرے ہم سے ہمسری

شہرہ ہے حرب و ضرب شہِ خاص و عام کا
سکہ ہے شش جہت میں ہمارے ہی نام کا

جد ہے مرا امیرِ عرب شحنۂ نجف
دادی جناب فاطمہ زہراؑ سی ذی شرف

میں پارۂ دلِ حسنؑ خوشخصال ہوں
ہیرے سے جو شہید ہوا اُس کا لال ہوں

ناگاہ فوجِ شام سے تیر بستم چلے
قاسمؑ بھی چھیڑ کر فرسِ خوش قدم چلے

پیدل تو اُس قطار کے تھے کس قطار میں
دو دو سوار کٹ گئے ایک ایک وار میں

ڈھالیں اٹھیں کہ دن شبِ دیجور ہو گیا
لامع جو برقِ تیغ ہوئی نور ہو گیا

آئی ہنسی اجل کو بھی اس طرح مر گئے
گھوڑوں پہ تن چڑھے رہے اور سر اتر گئے

تھا ابنِ سعد شوم کو اُس دم بہت ہراس
غرقِ سلاح ازرقِ شامی کھڑا تھا پاس

اُس نے کہا کہ فوج نہایت ہوئی ہے حواس
تو جا کے لڑ تو قتل ہو شاید یہ حق شناس

کہنے لگا بگڑ کے وہ باصد غرور و لاف
میں تب لڑوں اگر علیؑ آئیں پئے مصاف

فرق آئے گا نہ میری کبھی آن بان میں
لڑ کے سے لڑکے نام مٹا دوں جہان میں

بیٹوں کو میرے بھیج کہ چاروں دلیر ہیں
جنگ آزما ہیں سورما ہیں صفدر ہیں شیر ہیں

نکلا یہ بات سنتے ہی اُنہیں سوا ایک میل
پیچھے چلی شریر کے ہنستی ہوئی اجل

قاسم یہ نعرہ زن ہوئے چمکا کے راہوار
او خیرہ سر اجل تری گردن پہ ہے سوار

دشمن کو اپنی ضرب کا پنجہ قضا کا ہے
آ کوئی وار کر جو ارادہ وغا کا ہے

یہ سنتے ہی کماں کو اٹھا کر بڑھا شریر
قاسم نے ماری فرق پہ شمشیرِ بے نظیر

یوں قطع انگلیاں ہوئیں اُس تیرہ بخت کی
جیسے کوئی قلم کرے شاخیں درخت کی

چلّے سے چھوٹ کر جو چلا تیرِ بے اماں
قربان تیرے ہاتھ کے چالاکیٔ کماں

اک دم میں دی شکست خطا کو ثواب نے
غل تھا قفس کی تیلیاں توڑیں عقاب نے

مرکب سے گر کے مر گیا جب وہ عدو دیں
نکلا اُدھر سے تب پسرِ ثانی لعیں

نیزے کا وار کرنے لگا جب وہ خود پسند
بجلی سا کوندنے لگا قاسم کا بھی سمند

نیزے سے کور ہو گیا جس دم وہ خیرہ سر
پٹکے میں ہاتھ ڈال کے پٹکا زمین پر

جز موت کچھ شقی کو نہ اُس دم نظر پڑا
آنکھیں کھلیں تو قعرِ جہنم نظر پڑا

جھپٹا برادرِ سوم اُس کا بکر و نر
تانے ہوئے وہ گرز گراں سر کو دار در

یوں دو کیا عمود سرِ نابکار کو
جس طرح تیغ تیز اڑا دے خیار کو

مرتے ہی اُس کے فوج سے چوتھا پسر بڑھا
قاسم پکارے ادیل خود سر کدھر بڑھا

لڑتا وہ کیا کہ تیرِ اجل کا نشانہ تھا
اک ہاتھ میں نہ سر تھا نہ بازو نہ شانہ تھا

بیجاں ہوئے نبرد میں بیٹے جو اُس کے چار
ارزق کا دل ہوا صفتِ لالہ داغدار

جیب قبا کو مثلِ کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

شانے پہ تھی شقی کے دو دو ٹانک کی کماں
ارجن بھی جس سے سہم کے گوشہ میں ہو نہاں

کہتی تھی یہ زرہ بدن بد خصال میں
پکڑا ہے پیلِ مست کو لوہے کے جال میں

فوجیں اِدھر دعا کی چلیں سوئے آسماں
بل کھا کے اُس طرف یہ پکارا وہ بدزباں

ہے اُسکی فتح ساتھ میں ہوں جس کے رَیس کے
سر ہے کیا ہے دیو کو چٹکی میں پیس کے

قاسم نے دی صدا کہ بس اب کر زباں کو بند
اللہ کو غرور و تکبر ہے ناپسند

دیکھیں بلند کون ہے اور پست کون ہے
کھل جائے گا ابھی کہ زبردست کون ہے

بیٹوں کے غم نے کر دیئے مختل ترے حواس
گھبرا نہ بھیجتے ہیں تجھے بھی انہیں کے پاس

چیتلے ہیں جتنے سانپ وہ ڈستے نہیں کبھی
گرجے ہیں جو بہت وہ برستے نہیں کبھی

قائل کیا جو مصحفِ ناطق کے لال نے
تر کر دیا اُسے عرقِ انفعال نے

تکنے لگے صفوں سے جواں سب لڑے ہوئے
عباسِ نامدار قریب آ کھڑے ہوئے

نیزہ ہلا کے جانبِ قاسم بڑھا وہ بل
دولہا نے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل

ضیغم ہیں ہیبتیہ اسدِ ذوالجلال کے
کیجو سناں کے وار ذرا دیکھ بھال کے

یہ کہہ کے اپنی چھوڑ دیے نیزہ کو دی تکاں
چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں

بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ اضغی لپٹ گیا

قاسم نے زور سے جو انی کھینچی پھانی
بھاگا شقی کے جسم سے زورِ تہمتنی

اڑ کر گری زمیں پہ سناں اس تکان سے
گرتا ہے جیسے تیر شہاب آسمان سے

جھنجلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری اچکا کے سر

نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

چمکا کے تیغ تیز جو قاسم سنبھل گئے
سمجھا جو کچھ فرس کے بھی تیور بدل گئے

مانندِ شیرِ غیض میں آیا وہ سپلیتن
چلائے سب کہ گھوڑ کو بھی لو چڑھا ہے رن

میخیں زمیں کی اسکی تگاپو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

دشمن کو گیا نبرد میں جلینے کی آس ہو
لڑلے کٹاریاں یہ فرس جسکے پاس ہو

چھل بل دکھا کے فوج کو دو را تھما اڑا
صورت بنائی جست کی سمٹا جما اڑا

جن تھا پری تھا سحر تھا آہو شکار تھا
گویا ہوا کے گھوڑے پہ گھوڑا سوار تھا

دونوں طرف سے چلنے لگے دار یک بیک
دو بجلیاں دکھانے لگیں ایک جا چمک

چہرے پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی
یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

ہر بار جا نشین سے ہوتے تھے وار رد
تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بدخصال
جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ جسن کا لال

ادھیڑ لگی کہ ہوش اڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیئے سر پر سمند کے

گھوڑا بھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہاتھ تو دو ہو کے گر پڑا

غازی نے دی صدا کہ وہ مارا ذلیل کو
بچے نے آج لیٹ کیا مست پیل کو

رجز

عرب کی جنگوں میں رجز خوانی کا عام دستور تھا ہر بہادر اور ہر پہلوان اپنے مقابل کے سامنے اپنے قبیلہ اور اپنے خاندان کی بہادری کا فخر اور اپنی شجاعت و شرافت کا ذکر کرتا تھا عربی کی شاعری میں رجز کا خاص حصہ شامل ہے۔ شعرائے اُردو میں یہ حصہ مرثیہ گویانِ لکھنؤ کے سوائے کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔ اُن میں بھی میر انیس کے بیان رجز نے اُردو کو خاص فخر کا موقع دیا۔ ایسے ایسے رجز لکھے کہ انسان پڑھے اور پھروں جھومتا رہے۔ پہلے عربی میں امام حسین علیہ السلام کا رجز ملاحظہ ہو۔

امام حسین علیہ السلام کا رجز[۱]

کفر القوم وقد صار غبوا	عن ثواب اللہ رب الثقلین
کفر اختیار کیا اُس قوم نے اور پہلے ہی سے	یہ ثواب پروردگار عالم سے منحرف تھی
قتل القوم علیا وابنہ	حسنا غیر کریم الطرفین
اُس قوم نے علی اور اُن کے فرزند	حسن کو قتل کیا جو ہم میں خیر تھے اور کریم الطرفین تھے
حنقا ضمہم وقالوا اجمعوا	حشر الناس الی حرب الحسین
قتل اُنکا محض عداوت کے سبب تھا اور کہا اُن لوگوں نے	کہ بلاؤ گروہ ناس کو جنگ حسینؑ کے لئے
یا لقوم من اناس رُذّل	جمعوا الجمع لاھل الحرصین
کس قدر یہ قوم ذلیل ہے جنہوں نے	ایسا اجتماع اہل حرمین کے واسطے کیا ہے
وابن سعد قد رمانی عنوۃً	بجنود کوکوف الھاطین
اور ابن سعد نے مجھ پر قہراً اسی افواج کا ہجوم	کر دیا جنگی کثرت مثل بارش باران کے ہے

[۱] منقول از کتاب شہید اسلام تصنیف مولوی سید ہارون صاحب مطبوعہ عاوالاسلام لکھنؤ ۱۲

لا لشئ کان منی قبل ذا　　غیر فخری بضیاء الفرقدین

اس سے پہلے مجھ سے کوئی خطا نہیں ہوئی کہ سوائے اس کے کہ میں لوگوں (علی و نبی) کی ضیا و روشنی پر فخر کرتا تھا

بعلی الخیر من بعد النبی　　والنبی القرشی الوالدین

ایک تو علی کے سبب مجھے افتخار تھا جو بعد نبی ﷺ　　سب سے بہتر تھے اور نیز نبی قرشی النسل کے سبب سے

خیرۃ اللہ من الخلق علی　　ثم امی فانا ابن الخیرین

پسندیدہ خدا خلق میں علی ہیں پھر میری والدہ اور میں دو منتخب اور پسندیدہ بزرگواروں کا فرزند ہوں

فضۃ قد خلصت من ذہب　　فانا الفضۃ وابن الذہبین

میری مثال چاندی کی ہے جو سونے سے علیحدہ کر لی گئی ہو پس میں بھی فضہ (چاندی) ہوں اور فرزند دو ذہب یعنی علی فاطمہ کا فرزند ہوں

من لہ جد کجدی فی الوری　　او کشیخی فانا ابن العلمین

دنیا میں کون ہے جس کا نانا مثل میرے نانا کے ہو　　یا مثل میرے باپ کے ہو پس میں دو علم زاہر کا فرزند ہوں

فاطمۃ الزہراء امی وابی　　قاصم الکفر ببدر وحنین

فاطمہ زہرا میری ماں ہیں اور باپ میرا وہ ہے　　جس نے بدر و حنین میں کفر کے ٹکڑے اڑا دیئے

عبد اللہ عز وما یا فعا　　وقریش یعبدون الوثنین

اور جس نے لڑکپن سے خدا کی عبادت کی　　حالانکہ اسوقت قریش دو بتوں کی عبادت کرتے تھے

یعبدون اللات والعزی معا　　وعلی کان صلی القبلتین

قریش لات و عزیٰ کی عبادت کرتے تھے اور علی نے اسوقت تک دونو قبلوں (بیت المقدس اور بیت الحرام) کیطرف نماز پڑھی تھی

فابی شمس وامی قمر　　وانا الکوکب وابن القمرین

پس میرا باپ آفتاب اور ماں میری ماہتاب ہے　　اور میں ستارہ ہوں اور شمس و قمر کا فرزند ہوں

ولہ فی یوم احد وقعۃ　　شفت الغل بفضل العسکرین

جنگ احد میں انکا ایک حملہ ایسا تھا جسنے　　دونو لشکر کو مکمل درہم برہم کر کے سوزش دل کی تسکین کی

ثم فی الاحزاب والفتح معًا	کان فیھا خسف اھل قلیتین
پھر جنگ احزاب میں اور فتح خیبر کے دن	جس میں بر ابر اہل قلیتین ماری جارہی تھے
فی سبیل اللہ ماذا صنعت	امۃ السوء معا بالعترتین
یہ سب خدا کی راہ میں تھا	کیا کیا اس امتِ بد نے عترتین کے ساتھ
عترۃ البر النبی المصطفٰی	وعلی اور دیوم الجحفلتین
یعنی عترت رسول مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ	اور عترت کے ساتھ انکر قریش بقیہ عرب کے اجتماع کے دن

میر انیس کی معجز بیانی

امام حسینؑ کا رجز

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا	سرداریٔ فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علی خلق پیمبرؐ ہمیں بخشا	قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا
ہم نور ہیں گھر طور تجلا ہے ہمارا	
تختِ بن داؤد مصلا ہے ہمارا	
کس جنگ میں سینہ کو سپر کر کے نہ آئے	کس مرحلہ صعب کو سر کر کے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے	تھی کون سی شب جسکو سحر کر کے نہ آئے
تھا کون جو ایماں تہہ صمصام نہ لایا	
اُس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا	
اصنام بھی کچھ کم تھے نہ کفار تھے تھوڑے	طاقت تھی کہ عزیٰ کو کوئی لات سے توڑے
بدکیشوں نے سجدے بھی کئے ہاتھ بھی جوڑے	بے توڑے وہ بت حیدر صفدر نے نہ چھوڑے

کعبہ کو صفا کر دیا خالق کے کرم سے
نکلا اسد اللہ اذاں دے کے حرم سے

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرار کی تلوار
کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار
بجلی کی تو بجلی ہے یہ تلوار کی تلوار

قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

گر فیض ظہور شہ لولاک نہ ہوتا
بالائے زمیں گنبد افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا
ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا

یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا
ہم عرش پہ جب تھے تو یہ اسلام کہاں تھا

رجز امام

تم نار ہو میں نور خدائے دو جہاں ہوں
تم ننگ جہاں ہیں میں شرف کون و مکاں ہوں
تم جنگ میں روباہ ہو میں شیر ژیاں ہوں
تم کاہ سے کمزور ہو میں کوہ گراں ہوں

لاکھوں ہوں تو ہے فتح بہر کیف ہماری
کرتی ہے صفیں صاف سدا سیف ہماری

فخر عرب و روم و عجم کی ہے یہ تلوار
کاٹے ہیں نشاں جس نے علم کی ہے یہ تلوار
کاٹ اس میں غضب کا ہے ستم کی ہے یہ تلوار
مثل مہ نو بدر میں چمکی ہے یہ تلوار

ہلتی تھی زمیں ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
خندق کو اسی تیغ نے لاشوں سے بھرا تھا

پائی نہ اماں لشکر صفین و جمل نے
عنتر کو جلایا ہے اسی تیغ اجل نے
نہ لات نے مرکب کو بچایا نہ ہبل نے
کاٹا شجر کفر کو اس تیغ کے پھل نے

رکتی ہے نہ جوشن پہ نہ تھمتی ہے کمر پر
یہ مرگ مفاجات سے جلد آتی ہے سر پر

امام حسینؑ کا رجز

کس کے پدر کا نام جناب امیرؑ ہے
کس کا پدر رسول خدا کا وزیر ہے
وہ کون ہے جو صاحب تاج و سریر ہے
کون و مکاں میں کون بشیر و نذیر ہے

بنیاد کفر کس نے جہاں سے مٹائی ہے
کس نے نبی کے دوش پہ معراج پائی ہے

ہیں کس کے نام صفدر و کرار مرتضا
ذی علم و ذی سعادت و ذی النصر و ذی العطا
شیر و شجاع و صابر و معصوم و مقتدا
منصور و ارقیا و بلیلا و الیلیا

بازل وہی مظفر و منصور ہے وہی
غالب وہی ہے طور وہی نور ہے وہی

والد بہترین عرب ہے مرا پدر
روز ازل سے عاشق رب ہے مرا پدر
عالی حسب بلند نسب ہے مرا پدر
ایجاد آسماں کا سبب ہے مرا پدر

ہے حکم مثل کعبہ مرے احترام کا
فرزند ہوں میں مشعر و رکن و مقام کا

اولبند مکہ و عرفات و منا ہوں میں
میرا ادب کرو خلف مرتضا ہوں میں
حق ہے مرا کلام زبان خدا ہوں میں
مشکلکشا کا لال ہوں مشکلکشا ہوں میں

میزان مغفرت میں گناہوں کو تول دوں
عقدے جو لاکھ ہوں تو اشارے میں کھول دوں

وہ کس کی والدہ ہے جو ہے بضعۃ الرسول
مرضیہ و رضیہ و صدیقہ و بتول

مریم کی عرض ہوتی تھی جس طرح سے قبول
سب مرتبے وہی تھے خدا سے اُسی حصول

قرآں میں کون نور سمٰوات وارض ہے
طاعت وہ کس کی ہے جو زمانہ پہ فرض ہے

میں پارہ جگر ہوں بشیر و نذیر کا
ہے مجھ میں علم و فضل جناب امیر کا

میں نور ہوں جہاں میں سراج منیر کا
والد پیشوا ہوں صغیر و کبیر کا

اس میں بھی مصلحت ہے جو مظلوم آج ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں سر عالم کا تاج ہوں

حضرت عباسؓ کا رجز

رد کے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو
لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو

گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو
نے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو

دو ہاتھ ہیں علی کے پسر وار پار ہیں
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

تم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں
شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں

مہلت نہ ایک کو دم جنگ و جدال دیں
پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں

منہ دیکھتے ہیں جو ہیں نگہبان گھاٹ کے
لیجائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر
داد اشجاع باپ جو انمرد ہم دلیر

جب رن پڑا ہے کر دیئے ہیں رخصتوں کے ڈھیر
لائے ہیں جا کر آگ سے پانی خدا کے شیر

عفریت بھاگتے ہیں وہ چوٹیں ہماری ہیں
بیر العلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں

جرات جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں
سر کاٹتے ہیں پیر کے تیغوں کی آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں
فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں

ناصر ہیں بارگاہِ فلک بارگاہ کے
دفتر الٹ دیئے ہیں عرب کی سپاہ کے

حضرت عباسؓ کا رجز

جب گھر سے پئے جنگ قدم ہمنے نکالے
دم میں تنِ کفار کے دم ہم نے نکالے
کعبہ سے دعا کر کے صنم ہمنے نکالے
اسلام کے لشکر کے علم ہم نے نکالے

رنگِ رخِ کفارِ عرب ہو گیا فق سے
اک ضرب میں باطل کو جدا کر دیا حق سے

میں حشمتِ دنیا کی تمنا نہیں رکھتا
قطرے کی طمع فیضِ کادریا نہیں رکھتا
اعلیٰ جو ہے ادنیٰ کی وہ پروا نہیں رکھتا
پتے سے علاقہ سرِ طوبا نہیں رکھتا

کعبے کی طرف صاحبِ ایماں نہیں جاتے
بتخانے میں کعبے سے مسلماں نہیں جاتے

کچھ خارِ مغیلاں گلِ تر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

دولت نہیں انسان کی کچھ قدر بڑھاتی
دنیائے دنی کام کسی کے نہیں آتی
گو فقر ہو عالی نسبی پر نہیں جاتی
بینا جو ہیں وہ دیکھتے ہیں جوہرِ ذاتی

محتاجی سے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا

عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

علی اکبرؓ کا رجز

تازی کو تیز کر کے یہ اکبرؓ نے دی صدا
اوخوں گرفتہ کچھ تجھے دعویٰ ہو گر تو آ

انساں کو آپ اپنی ستائش نہیں روا
قائل ہیں جس کے سب وہ ہمارا ہے مرتبا

ذی قدر ہیں سعید ہیں عالی جناب ہیں
ذرے بھی جانتے ہیں کہ ہم آفتاب ہیں

یوسف نہیں ہے وہ جو کرے دعوئ جمال
کب بدر نے کہا کہ میں ہوں صاحب کمال

پایا ہے آفتاب نے کیا اوج کیا جمال
کی سرکشی ادھر کہ اُدھر ہو گیا زوال

شیطاں کو وصل نار کا آدم کو نور کا
یہ عجز کا ثمر ہے وہ پھل ہے غرور کا

ظالم کسی کے فخر کو ہم مانتے ہیں کب
روشن ہے آفتاب سے اپنا حسب نسب

کس کا ہے جد شفیع امم سید عرب
ہم سے بزرگ کوئی نہیں غیر ذات رب

جو دست ہے خدا کا پسر اُس ولی کے ہیں
کافی ہے بس یہ فخر کہ پوتے علیؓ کے ہیں

علی اکبرؓ کا رجز

روشن گر آئینہ دیں ہیں تو ہمیں ہیں
گر مہر نبوت کے نگیں ہیں تو ہمیں ہیں

اور بعد نبی تخت نشیں ہیں تو ہمیں ہیں
اسرار الٰہی کے امیں ہیں تو ہمیں ہیں

قدسی ہیں معرف سحر و شام ہمارے
جو عرش پہ لکھے ہیں وہ ہیں نام ہمارے

اللہ نے سب طرح کی دولت ہمیں دی ہے
عزت ہمیں بخشی ہے شرافت ہمیں دی ہے
کونین کو بخشی وہ شرافت ہمیں دی ہے
قایل ہیں عرب جسکے وہ جرأت ہمیں دی ہے

روباہوں کے حیلوں سے تردد ہمیں کیا ہے
ہم شیر ہیں اُس شیر کے جو شیرِ خدا ہیں

زیبا ہے ہمارے ہی لئے رتبہ شاہی
ہیں حکم شریعت کے ہمیں امر و نواہی
ہے آل محمدؐ کا غضب قہرِ الٰہی
برہم ہوں تو آجائے زمانے پہ تباہی

برقِ غضبِ حضرتِ باری نہیں رُکتی
لاکھوں سے کبھی تیغ ہماری نہیں رُکتی

عونؑ و محمدؑ کا رجز

تلوار جنہیں حق نے عطا کی ہے وہ ہم ہیں
جن غازیوں نے دیں کی بنا کی ہے وہ ہم ہیں
خوجن میں شہ عقدہ کشا کی ہے وہ ہم ہیں
دولت جو رسولِ دوسرا کی ہے وہ ہم ہیں

کیا عرشِ الٰہی پہ جگہ آج ملی ہے
کاندھے پہ نبیؐ کے ہمیں معراج ملی ہے

بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے
دم میں حق و باطل کو جدا کر دیا کس نے
عالم کو طلب گارِ خدا کر دیا کس نے
اسلام کی قوت کو سوا کر دیا کس نے

در کفر کا خالق کی عنایات سے توڑا
عزّیٰ کا سر نخس و نجس لات سے توڑا

تقسیم ہوئی دولتِ دیں گھر سے ہمارے
شاہوں کو ملے تاج و نگیں گھر سے ہمارے
ہے پیشِ نظر خلدِ بریں گھر سے ہمارے
تعلیم ہوا روحِ امیں گھر سے ہمارے

دیر آئے کہ مسکن تھا بہت دور ہمارا

آدم سے جو پہلے تھا وہ ہے نور ہمارا

خوشنود رہا یزدِ باری اسی گھر سے
سب سیکھ گئے شکر گزاری اسی گھر سے
کفار ہمیشہ رہے عاری اسی گھر سے
احکام ہوئے شرع کے جاری اسی گھر سے

آتے ہیں زباں پر وہی جو کلمۂ حق ہیں
ہم مصحفِ ناطق کے صحیفہ کے ورق ہیں

تیغوں کو جو کھینچیں تو صفیں دم میں الٹ جائیں
آگے جو بڑھیں ہم تو پرے فوج کے ہٹ جائیں
سرتن سے سواروں کی ہر اک ضرب میں کٹ جائیں
للکاریں تو شیروں کے کلیجے ابھی پھٹ جائیں

امت پہ کرو رحم یہ حکمِ شہ دیں ہے
ناچار ہیں سبقت کا ہمیں حکم نہیں ہے

مناجات

فارسی اور اُردو میں بہت سی مناجاتیں نظر آتی ہیں جن میں اکثروں کا یہ حال ہے کہ وہ مصنف کے شاعرانہ خیال کا نمونہ ہیں۔ مثلاً ایک شاعر ہے کہ اُس نے عاشق بن کر عشق کے سوز و گداز کا اظہار کیا ہے جو اس کے دل میں نہیں یا کسی سخن طراز نے صوفی بن کر اپنے کلام کو صوفیانہ رنگ میں ڈوب دیکر نکالا ہے حالانکہ وہ فی الحقیقت عرفان و تصوف سے ناآشنا ہے یا بعض واعیوں نے مناجات میں خدا سے چشم گریاں و خاطر بریاں دیدۂ پُرآب و دل بیتاب کی آرزو کی ہے اور چاہا ہے کہ اے خدا مجکو ایسا دل دے جو درد سے بھرا ہو اور وہ آہِ شرر بار عطا کر جس کی ایک چنگاری ماسوا اللہ کو پھونک ڈالے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میر انیس نے مناجات میں بھی اپنے قال کو اپنے حال کے موافق ظاہر کیا ہے۔ اور خدا سے وہی سامان مانگا ہے جو میر انیس جیسے زبان آور سے مناسبت

صحیح رکھتا ہے اور جس سے ایک شاعر کی سچی فطرت اور اُس کی صحیح آرزو کے منشا و مقصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر انیس نے کئی مقام پر مناجات کے بند لکھے ہیں اُن میں سے ایک مناجات کے چند بند لکھے جاتے ہیں۔

میر انیس کی مناجات

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر

اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کی جاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری

بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواص طبیعت کو عطا کر وہ لآلی
ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی

ہو جن کی جگہ تاجِ سرِ عرش پہ خالی
عالم کی نگاہوں سے گرے قطب شمالی

سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کے یہ ہونگے جنہیں رشتہ ہر نی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس درج دہاں کو
دریائے معانی سے بڑھا طبع رواں کو

آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو
عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حسن بیاں کو

تحسیں کا سموات سے غل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور چلیں جام
جس میں عوض نشہ ہو کیفیتِ انجام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایام
صوفی کی زباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام

ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آگئی ہے خلد بریں سے

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم
خیبر کی خبر لائے مری طبع اولوالعزم
قطع سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم
دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم

جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ہو ایک زباں ماہ سے تا ماہیِ دریا
عالم کو دکھا دے برشِ سیفِ الٰہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی
لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی

ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

میر انیس کی سیف زبانی

ناظرین غور سے پڑھئے اور انصاف کیجئے کہ میر انیس مرحوم نے تلوار کے کیا کیا مضمون نکالے ہیں جو نہ فردوسی کو نصیب ہوئے اور نہ شاہنامۂ نظامی میں نظر آتی ہیں۔ غالباً آپ کو کسی زبان میں یہ دلنشین مطالب ڈھونڈے سے نہ ملیں گے۔ یہ معجزۂ کلام نہیں تو کیا ہے۔

شمشیر آبدار

بے پانوں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی

دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی

تھا سیر اتھا بدن رنگ زمرد سے بھرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جو اس کا بھرا تھا

زیبا تھا دم جنگ پریوش اُسے کہنا
معشوق بنی سرخ لباس اُس نے جو پہنا

اس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا
جوہر تھے کہ پہنے تھی دلن پھولوں کا گہنا

سیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شمشیر سے دولھا کی بغل میں

ہر ڈال کے پھولوں کو اڑاتا تھا پھل اُس کا
تھا لشکر باغی میں اجل سے عمل اُس کا

ڈر جاتی تھی مُنہ دیکھ کے ہر دم اجل اُس کا
تھا قلعہ چہار آئینہ گویا محل اُس کا

اس در سے گئی کھول کے وہ در نکل آئی
گہ صدر میں بیٹھی کبھی باہر نکل آئی

پہنچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا

شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا

اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

تلوار

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دو سر گری
کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری

چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری
سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری

زرہیں تنوں میں مثل کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفوں کی صفیں خاک ہو گئیں

پڑتی تھی جس کے فرق پہ وہ تیغ سر شگاف
ہوتا تھا سر سے مثل قلم تا جگر شگاف

تا سینہ کوئی اور کوئی تا کمر شگاف
چار آئینہ کسی کا کسی کی سپر شگاف

سر تھا اگر تو ہاتھ کا تن پر اثر نہ تھا
ثابت کسی کے ہاتھ اگر تھے تو سر نہ تھا

اک برق سی چمکتی تھی بالائے سطح آب
گاہے سوئے سمک تو کبھی جانب سماک
جوشن تو پارہ پارہ تھے اور جسم جا بجا چاک
دم لیتی تھی نہ تیغ نہ رکتا تھا دست پاک

ڈر سے اسی کے کفر کی بنیاد پست تھی
اسلام کو ظفر تھی بتوں کو شکست تھی

جب صف پہ وار کرتے تھے سلطان بحر و بر
اڑتی تھی کٹ کے صورت کاغذ ہر اک سپر
چھپتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتی تھے خاک پر
قبضوں سے تیغیں جسم سے رد ہیں تنوں سے سر

پے تھے قدم گریز کے رستے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تیز تھے اعدا سپند تھے

چھپتے تھے یوں وہ دیکھ کر اس تیغ کی چمک
بھاگے شعاع مہر سے جس طرح شپرک
اوج سما سے زلزلہ برپا تھا تا سمک
چمکی وہ جب تو کانپ گئے چرخ پر ملک

ہر شے تھے خوف جاں سے خضوع و خشوع میں
سجدہ میں تھی زمیں تو فلک تھا رکوع میں

جانوں کو چھوڑتی نہ تھی وہ تیغ برق دم
تھی اس کی ناب جادۂ سر منزل عدم
ہر جوہر اس کا دیدۂ بینا سے تھا نہ کم
اعدا کو ڈھونڈتی تھی وہ قدسی لئے تھا خم

تھی موج بحر قہر خداوند گیر میں
سیل فنا کا جال تھا اس کے خمیر میں

بجلی سی کوند کر جدھر آئی جلا گئی
دم میں چراغ راہ ضلالت بجھا گئی
لشکر میں فرد فرد کو جوہر دکھا گئی
خوں سے بھرا نہ پیٹ تو لوہے کو کھا گئی

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آ کے اوج سے
پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

چلاتی تھیں کمانیں کہ کس جا ہوں گوشہ گیر
ہم تو خطا شعاروں کی قبضے میں ہیں اسیر

چلنے میں نیزوں کانپتے تھے مثل پائے پیر
سہمے ہوئے نکلتے نہ تھے سرکشوں کے تیر

دم بند خنجروں کے بھی تھے اُس مصاف میں
تیغیں چھپی تھیں خوف کے مارے غلاف میں

تلوار

جس فرق پر چمک کے وہ برق اجل گئی
بوسہ زمین پاک کو دے کر نکل گئی

جس صف کو آنچ لگ گئی اُسکی وہ جل گئی
کاٹا کسی کو گر تو کسی کو نگل گئی

ضربت پہ عقل دیکھنے والوں کی دنگ تھی
افعی کسی جگہ تو کسی جا نہنگ تھی

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر
بہتی ہے جس کی آگ سے کوسوں لہو کی نہر

ناگن ہے یہ کہ کاٹے کی جسکی نہیں ہے لہر
اتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر

زخموں سے جسم ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندانِ مار ہیں

سر پر پڑی فرس کے تو سوئے کفل چلی
وہ مُنہ کے بل زمیں پہ چلا یہ نکل چلی

بجلی سی جس لعیں پہ چلی برمحل چلی
پھُنچی اوہر سے تیغ اُدھر سے اجل چلی

دو آفتوں نے دشمنِ دیں کو دبا لیا
سر تیغ نے لیا تو اجل نے گلا لیا

جب حملہ ور امامِ مسیحا نفس ہوئے
نیچے ہوئے سوار تو اوپر فرس ہوئے

کشتوں کے ڈھیر اس چپ و پیش و پس ہوئے
پانچ آ گئے جو تیغ کے نیچے تو دس ہوئے

کشتوں کی شکل خوں سے جو روپوش ہو گئی
گنتی اجل کو اوّلوں کی فراموش ہو گئی

تلوار

افعی کی طرح منہ سے نکالے تھی زباں تیغ
ہر دم صفِ کفار پہ تھی شعلہ فشاں تیغ
گرتی تھی چمکا کر کبھی یاں اور کبھی واں تیغ
چھپتے تھے جھپٹا جو یہ دیتی تھی اماں تیغ

قبضے میں جو سب فوج تھی اُس تیغ دوسر کے
بچ سکتے تھے دشمن نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

پیشہ وہ کہ لشکر کو پریشاں کیا جس نے
آب ایسی کہ خشکی میں یہ طوفاں کیا جس نے
دم ایسا کہ سب فوج کو بیجاں کیا جس نے
بر ایسا کہ جنگل کو گلستاں کیا جس نے

سر سکیڑوں کاٹے تھے یہ رنگ اُس کا ہرا تھا
ہر زاب میں ناگن کی طرح زہر بھرا تھا

قبضہ وہ جسے رکھتے تھے قبضے میں ید اللہ
نایوں سے عیاں تھا کہ عدم کی ہے یہی راہ
جوہر وہ کہ ہر فرد بشر جس سے ہو آگاہ
قد آفتِ دوراں برش العظمۃ للہ

باڑھ ایسی مقابل کبھی دریا نہیں جس سے
گھاٹ ایسا کہ جھٹیا کوئی اترا نہیں جس سے

وہ سیل جد ہر آئی طلاطم نظر آیا
آنکھوں سے نہاں مجمع مردم نظر آیا
رہچل میں سواروں کا پرا گم نظر آیا
جو تھا بسر زیں وہ تہ سم نظر آیا

منہ کھول کے اژدر نے نوالہ کیا سب کو
بجلی کی تڑپ نے تہ و بالا کیا سب کو

تلوار

فوجوں کو دے جواب وہ تیزی زبان میں
ترکش میں چھوڑے تیر نہ چلے کمان میں

پانی وہ تھا کہ آگ لگا دے جہان میں
نازل ہوا تھا آیۂ برق اُس کی شان میں

بے فتح پھیرتی تھی نہ مُنہ کارزار سے
دعوائے مہدوی تھا اُسے ذوالفقار سے

جوہر وہی برش کا وہی طور خم وہی
تیزی وہی غضب کی وہی کاٹ دم وہی
چلنا اُسی طرح کا چمک دمبدم وہی
رنگت زمردی وہی پانی میں سم وہی

بے مثل آبرو میں اصالت میں نیک تھی
مل جاتیں دو زبانیں بھی اُس کو تو ایک تھی

کاسے سروں کے ٹھوکریں کھاتے تھے جا بجا
تودے کمانوں کے نظر آتے تھے جا بجا
گوشوں میں گورخوں کو چھپاتے تھے جا بجا
لیکن سروں پہ تیغ کو پاتے تھے جا بجا

بھاگیں نہ کس طرح قدر انداز سہم کے
واں تیر کیا کہ جلتے تھے پر مرغ وہم کے

بے رُخ کمانیں تیروں سے چلے کماں سے دور
مرغانِ تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دور
برچھی سے پھل گرے ہوئے نیزے سناں سے دور
پیروں سے عقل دور تہور جواں سے دور

رایت جھکے ہوئے تھے صفیں پائمال تھیں
کاندھوں پہ روسیاہوں کے ڈالیں نڈھال تھیں

بھاگے تھے خود اپنی بلا سر پہ ٹال کے
بھالے چھپے تھے امن کی جا دیکھ بھال کے
تلواریں مُنہ چھپاتی تھیں دامن میں ڈھال کے
زرہیں تھیں یا کھلے ہوئے حلقے تھے جال کے

چار آئینے پڑے تھے زمیں پر کٹے ہوئے
لٹکے تھے جوشنوں کے گریباں پھٹے ہوئے

ٹکڑے تھیں بیرقیں تو نشاں سب تھے سرنگوں
ثابت الف نہ تیروں کے تھے ذی کماں کے نوں
بھیا لہو کی آئی یہ برساز میں پہ خوں
چلاتے تھے زمیں پہ تڑپ کر سیہ دروں

تھراتے ہیں پہاڑوں کے دل اُس کی کاٹ سے
ندی چڑھی ہوئی ہے سرک جاؤ گھاٹ سے

خالی کئے دلیر نے جنگل بھرے ہوئے
سر یوں گرے اُدھر تھے جدھر دُل بھرے ہوئے

نہرا رہے تھے خون سے جل تھل بھرے ہوئے
جیسے کبھی برستے ہیں بادل بھرے ہوئے

اس زور و شور سے کبھی لڑتا نہیں کوئی
یوں دو نگڑا اساڑھ میں پڑتا نہیں کوئی

چھائی ہوئی تھی ڈھالوں کی ہر سو گھٹا سیاہ
بجلی چمک رہی تھی کہ اللہ کی پناہ

چھپنے کی نے جگہ نہ کہیں بھاگنے کی راہ
ندی چڑھی تھی فوج کا بیڑا تھا سب تباہ

جو گھاٹ پر تھا خون میں وہ شور بور تھا
سارا یہ تیغ تیز کے پانی کا شور تھا

امام حسینؑ کی سلاح جنگ

بالائے دوش حضرت حمزہؓ کی ہر وہ ڈھال
زیبا ہے کہئے گر رخ فتح و ظفر کا خال

پھول اُسکے وہ کہ تیغ کا پھل جس سے پائمال
شب میں عیاں تھے چار ستارے تو اک ہلال

اس کو عروج کیوں نہ ملے قتل گاہ میں
پشت و پناہ خلق ہے جس کی پناہ میں

وہ آہنی کلہ وہ زرہ جامۂ حضور
جس کی ہر اک کڑی سے نکلتا تھا چھن کے نور

حلقے وہ جن کو دیکھ کے شرمائے چشم حور
قندیل آہنی میں فروزاں ہے شمع طور

جوشن نہ تھا تن شہ گردوں وقار میں
تارے چمکتے تھے شب تاریک و تار میں

شانے پہ کس شکوہ سے ہے حلقہ کماں
ہر جسکے ڈر سے قوس قزح چرخ پر تپاں

پیغام موت کا ہے ہر اک تیر جاں ستاں
ہر دم صدا یہ ہے لبِ سوفار سے کہ ہاں

سرکش کہاں ہیں لشکرِ کج عقل و فہم کے
گوشوں میں چھپتے پھرتے ہیں کیوں سہم سہم کے

دستانہ ہے کہ قبضۂ سیفِ قضا ہے یہ
شمشیر ہے زبان دہن اژدہا ہے یہ

ہمدست آستین شہِ لافتا ہے یہ
ثابت ہوا کہ پنجۂ شیرِ خدا ہے یہ

دستِ خدا کے لال جڑی ہیں دلیر میں
اس ہاتھ سے جہاں کے زبردست زیر ہیں

نیزہ ہے رشکِ افعیِ گیسوئے دلستاں
سینے کو جسکے ڈر سے چراتا ہے آسماں

کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں
غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں

لشکر وہ دیو کا ہو تو دم میں ہلاک ہو
اس کی ہوا لگے تو بدن جل کے خاک ہو

تلوار

پرسے اُدھر سے تیر تو کوندی ادھر سے برق
وہ برق چھپتی پھرتی تھی خود جس کو ڈر سے برق

چمکی وہ یوں کہ گر گئی سب کی نظر سے برق
روکیں کسے رُکی ہے کسی کی سپر سے برق

جل تھل بھرے لہو کی نہ دیر اک گھڑی لگی
کیا ابر تیغ تھا کہ سروں کی جھڑی لگی

معجز نما تھی شاہ کی شمشیر آبدار
دکھلائی ماہِ سیف میں برسات کی بہار

یاں برق واں ہوا تو ادھر ابر رد و بار
بھیا کہیں لہو کہیں خوں کی آبشار

یوں سر برس گئے یہ روانی تھی باڑھ میں
بڑتا ہے دونگڑا کبھی جیسے اساڑھ میں

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
تلتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے

پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہاتھ میں اڑا کے کلائی نکل گئی
کوندی گری زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی

چار آئینے کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتی تھے خاک پر
پہنچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر
قبضے سے تیغ برسے زرہ ہاتھ سے کمر
برچھی سے پھل کمان سے زہ زین سے تبر

ترکش کہیں پڑے تھے نشانِ زری کہیں
پیکاں کہیں تھے شست کہیں تھی سری کہیں

پہنچی سم فرس پہ جو بالائے سرگری
چمکی ادھر زمیں سے نکل کر ادھر گری
ناری جلے اُدھر وہ جدھر کوند کر گری
جس صف پہ لگ چلی یہ وہ صف خاک پر گری

دکھلا کے اوج جاتی تھی یوں ہر سوار پر
جنگل میں باز گرتا ہے جیسے شکار پر

بازو ہر اک کمان کا کمزور ہو گیا
تیروں کے مینھ برسنے کا اک شور ہو گیا
ڈھالوں کا ابر خوں میں شرابور ہو گیا
جو تھا کنارِ نہر لبِ گور ہو گیا

مشقِ شناوری تھی قیامت بڑھی ہوئی
اتری وہ تیغ خون کی ندی چڑھی ہوئی

دم کی تھی دعا شاہ نے کیا تیغ دو دم پر
نے خود پہ رکتی تھی نہ تھمتی تھی جھلم پر
گردن سے جو سینے پہ تو سینے سے شکم پر
تو بن سے رکابوں پہ رکابوں سے قدم پر

جوشن میں فتوحی میں نہ بکتر میں نہ زیں میں
سم کاٹ کے گھوڑے کے جو دیکھا تو زمیں میں

کس سر پہ چڑھی تیغ کہ تو سن پہ نہ اُتری
وہ کونسا تو سن تھا کہ یہ سن سے نہ اُتری
بے جان سے بے جسم تہتن سے نہ اُتری
اُتری جو نہ وہ موت بھی گردن سے نہ اُتری

دشمن کو نہ زندہ کسی جا موت نے چھوڑا
تیغ اُتری کمر سے تو گلا موت نے چھوڑا

انبار تن و سر کے سراسر تھے زمیں پر
تن تھے کسی جا اور کہیں سر تھے زمیں پر
کاٹے ہوئے ہتیار برابر تھے زمیں پر
جوشن کہیں ٹکڑے کہیں مغفر تھے زمیں پر

بیجاں کہیں دو اہل ستم ساتھ پڑے تھے
ریتی پہ کہیں پاؤں کہیں ہاتھ پڑے تھے

ناری کو سقر تک کبھی پہنچا کے پھر آئی
دیکھا کسی موذی کو تو بل کھا کے پھر آئی
ناگن کی طرح سن سے کبھی جا کے پھر آئی
جانا تھا کہ بس فوج پہ لہرا کے پھر آئی

غل تھا کبھی یوں تیغ کو چلتے نہیں دیکھا
اغی کو بھی یہ زہر اگلتے نہیں دیکھا

تلوار

بجلی کی چمک لشکر دشمن کو دکھائی
شعلے کی لپک ناریوں کے تن کو دکھائی
تیزی دم شمشیر نے جوشن کو دکھائی
کٹ کٹ گیا ایسی برش آہن کو دکھائی

کس طرح بھلا اہل ستم دنگ نہ ہو جائیں
چار آئینہ شش در تھے کہ چوزنگ ہو جائیں

سر اُڑ گئے گردن سے تو خود اُڑ گئے سر سے
شانوں سے تو ڈھالیں زمیں پر گر گئیں برسے
پھل برچھیوں کے کٹ کے گرے پھول سپر سے
دستانے تو ہاتھوں سے کمر بند کمر سے

اعدا کی صفیں خوف سے منہ موڑ کے بھاگیں
روحیں قفسِ جسم سے جی چھوڑ کے بھاگیں

چار آئینے والے برشِ تیغ سے تھے دنگ
جوہر تھے عجب اور عجب آب عجب رنگ
پڑتی تھی جو سر پر تو ٹھہرتی تھی نہ تنگ
اسوار تو اسوار فرس ہو گئے چور نگ

غل تھا کہ دہن کھولے ہوئے صورتِ لاہی
لو کھا گئی گھوڑے کو بھی منہ ہے کہ بلا ہے

جب خود پہ بیٹھی تو جھلم کاٹ کے اٹھی
دستانے کو مانند قلم کاٹ کے اٹھی
جوشن پہ جو آئی تو شکم کاٹ کے اٹھی
سر پر جو پڑی تا بقدم کاٹ کے اٹھی

بالا تھی وہ شمشیر ستمگار فرد تھا
دیکھا تو فرس بھی اسی اک ضرب میں دو تھا

بجلی تھی پہ جنگل کے لئے بن گئی جاروب
کچلے گئے سر انکے جو تھے فوج کے سرکوب
تارے تلک آتے ہوئے کانپتی تھی چوب
ہیبت سے لرزتا تھا وہ صحرائے پر آشوب

شمشیر کے شعلے کی حرارت جو بڑی تھی
خورشید کو گردوں پہ تپ لرزہ چڑھی تھی

بجلی سی ہوا پر کبھی چمکی کبھی ٹھیری
تھی عکس سے دریا کی ہر اک لہر سنہری
پایاب تھی خوں کی کہیں ندی کہیں گہری
راحت میں نہ بری تھے نہ بحری تھے نہ شہری

جو خاکی و آبی تھا وہ تھا نوحہ گری میں
خشکی میں تباہی تھی تلاطم تھا تری میں

علی اکبرؓ کی تلوار

آئی جو سن سے سینہ کی جانب اڑا کے سر
دہشت سے گرا سمند کی ٹاپوں پہ آ کے سر

مرکب نے کی نظر سوئے راکب اُٹھا کے سر
نکلی وہ تیغ تیز نعل سے جھکا کے سر

ظالم نئی طرح سوئے دوزخ روانہ تھا
سر تھا نہ صدر تھا نہ سپر تھی نہ شانہ تھا

جب آئی سن سے کاٹ کے جوشن نکل گئی
اڑ کر صفوں کے بیچ سے ناگن نکل گئی

یوں چاک کر کے سینۂ دشمن نکل گئی
شہ رگ سے جان صدر سے گردن نکل گئی

سالم رگیں نہ جسم کی نہ استخواں رہے
ٹوٹے قفس میں طائر وحشی کہاں رہے

پھول اڑ گئے پھل اُسکا جو چمکا سپر کے پاس
نکلی اُدھر سپر سے کہ آ پہنچی سر کے پاس

سے اتر گئی دل بیدادگر کے پاس
دل سے جگر کے پاس جگر سے کمر کے پاس

کھولا کمر کا بند تو در آئی زین میں
زیں سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

بل کھا کے اس طرف سے کوئی بڑھ کے یا اگر
پہنچا سمند اٹھا کے برابر وہ شیر نر

چمکی جو تیغ برق سی کوندی ادھر ادھر
آئی لہو میں تیر کے وہ مانند خنجر

چھوڑا اسے ارکو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب
آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب

سیلی تھی اک پری کہ شکم پر اُسکی ناب
تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب

جوہر سے اُس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خون فوج کی اور آبدار بھی
غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی

بجلی بھی ابر تر بھی خزاں بھی بہار بھی
تلوار بھی چھری بھی اسپہ بھی کٹار بھی

پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

کرتی تھی پائمال صفوں کو وہ برق سیر
دہشت سے تھا سپاہِ شقاوت کا حال غیر
سنے خود کو پناہ نہ اُس سے سپر کی خیر
چار آئینہ سے لاگ تھی اُسکو سپر سے بیر

سکے پڑے تھے اکبر غازی کی حرب کے
لوہا بھی دب گیا تھا یہ معنی ہیں ضرب کے

نیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم
مثلِ قلم زبان دراز سناں دو نیم
چار آئینے کٹے ہوئے گرز گراں دو نیم
مغفر سے تا کمر جدِ پہلواں دو نیم

سالم تھا پیش آئینہ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کونسا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صفِ کفار ہٹ گئی
چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو اُلٹ کر پلٹ گئی
رن کی زمیں لہو کے ڈریروں سے پھٹ گئی

دریا بھی آب تیغ سے بے آبرو ہوا
غسل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

علی اکبرؓ کی تلوار

الماس کی زباں آوریٔ تیغِ بلا نوش
زہریں ہمہ تن چشم تھیں ڈھالیں ہمہ تن گوش
گھاٹ ایسا کہ ڈر سے لب دریا بھی ہیں خاموش
باڑھ ایسی کہ ہیں مچھلیاں پانی میں زرہ پوش

کٹتے ہیں گلے تیز زبانی سے اسی کی
دریا بھی ہے چکر میں روانی سے اسی کی

تا ہیں وہ کہ شہ رگ کسی گردن میں نہ چھوڑیں
دشمن کا گلا قلعۂ آہن میں نہ چھوڑیں

جوہر وہ کہ ساتھ کسی جوشن میں نہ چھوڑیں
پشتے وہ قیامت کہ لہو تن میں نہ چھوڑیں

مُنہ وہ ہے کہ دم سے شطِ خوں بہتی ہو جسکے
قبضہ وہ ہے قبضہ میں ظفر رہتی ہے جسکے

ہمچشم تھا ابرو سے حسینوں کے خم اُسکا
الدر ہی چمک برق بھی بھرتی تھی دم اُسکا

ناگن تھی اُترتا ہی نہ تھا چڑھ کے سم اُسکا
ہر ہاتھ میں ہاتھ اس کا تو بازو قلم اُسکا

جوہر کی چمک دیکھی نہ ہیروں کی نگوں میں
یوں دوڑتی تھی تن میں لہو جیسے رگوں میں

اک برق سی گرتی تھی ہر اک دشمنِ جاں پر
گہ سر پہ گئے ڈھال پہ تھی گاہ سناں پر

ترکش پہ کبھی سن سے گئی گاہ سناں پر
کس طرح بھلا ذکر برش لاؤں زباں پر

دل سے کہیں جانے کی ہوس قطع نہ ہو جائے
دم بند ہے ڈر سے کہ نفس قطع نہ ہو جائے

لوہے سے اُسی تیغ کے آئینہ بنے گر
عکس اُس میں جو دشمن کا نظر آئے تو ڈر سے

پائے نہیں تا حشر کسی حربے نے یہ جوہر
ذکر اُس کی برش کا جو مسافر کے ہو لب پر

قطاع طاق آدے تو وہ خوف سے ہٹ جائے
کیسی ہی کڑی راہ ہو اک آن میں کٹ جائے

حضرت عباسؓ کی تلوار

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا
یہ صف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا

بجلی سا ہر جگہ فرس تیز گام تھا
ششدر تھی موت چار طرف قتل عام تھا

اس غول پر کبھی تھی کبھی اُس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

مُنہ پھر گئے سپاہ کے جس سمت رُخ کیا
یاں سے وہاں گئے اسے مارا اُسے لیا
باقی رہے ہزار میں سو دس میں اک جیا
اللہ رے دم لہو پہ لہو تیغ نے پیا

اس پر بھی تشنگی میں نہ تسکیں ذری ہوئی
گویا تھی آگ پیٹ میں اُسکے بھری ہوئی

چلتا تھا مثل برق یمین و یسار ہاتھ
ڈر ڈر کے جوڑتے تھے ضلالت شعار ہاتھ
ان کی نہ ایک چوٹ نہ اُنکے ہزار ہاتھ
کافی تھے سب کو تیغ دودستی کے چار ہاتھ

آواز شش جہت میں بگیر و بزن کی تھی
اللہ کا کرم تھا مدد بیچ تن کی تھی

نعرہ جدا صدائے بگیر و بزن جدا
گوشے کماں سے دور تھے گوشوں زرہ جدا
بکتر جدا زمین پہ ٹکڑے زرہ جدا
نیزوں کو دیکھئے تو گرہ سے گرہ جدا

اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تنوں میں دم نہ تھے

نیزے اُدھر قلم تو اِدھر برچھیاں قلم
ترکش دو نیم ٹکڑے کماں نیم شاں قلم
ہر ہاتھ میں قلم کی طرح استخواں قلم
مُنہ تیغ کا خراب سناں کی زباں قلم

جب سن سے سر پہ آئی کسی بدخصال کی
گویا سموم چل گئی پھولوں پہ ڈھال کے

وہ تیغ کھول دیتی تھی لوہے کا بھی حصار
تھا اُس کے ہاتھ سے دلِ چار آئینہ فگار
عاری تھیں مُنہ پہ تیغوں کے ایسے پڑے تھے وار
خود اپنے سر پٹکتے تھے گر گر کے بار بار

پانی وہ زہر تھا کہ پیا اور فنا ہوا
ہے آج تک زرہ کا کلیجہ چھنا ہوا

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس
بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس

قبضے کے پاس تیغ نہ دشنہ کمر کے پاس
کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس

نیزے نہ تھے سناں پہ نہ پرچم نشان پر
پیکاں نہ تیر پر تھا نہ چلہ کمان پر

حضرت عباسؓ کی تلوار

کھا کھا گئی صفوں کو برابر لڑائی میں
ٹھیری نہ بے لہو پیئے دم بھر لڑائی میں

ثابت رہے تھے جن کے قدم ہر لڑائی میں
پہلے انہیں کے کاٹ گئی سر لڑائی میں

دو ٹکڑے ہو کے گرتا تھا جو راہوار سے
یہ اُٹھ کے داد مانگتی تھی ذوالفقار سے

جس غول پر گری نہ تھمی نار کی کہیں
اک دم بھی کی نہ اسکی برش نے کمی کہیں

چمکی کہیں کسی پہ کسی جا رہی کہیں
فوجوں میں اِستری تھی کہیں ہی کہیں

کاٹے ہوئے نشاں تھے زمیں پر پڑے ہوئے
ہر جا تھے ضرب تیغ کے جھنڈے گڑے ہوئے

جب وار چل گیا سپر آہنیں کٹی
دستانہ کٹ کے ہاتھ سے آستیں کٹی

مغفر کٹا دو نیم ہوا جبیں کٹی
سینے کو لیکے زین سے جو اتری زیں کٹی

چورنگ تھا فرس تو دو پارا سوار تھا
اللہ رے مُنہ کہ تیغ نے جانا خیار تھا

آئی جدھر لہو میں سراسر بھری ہوئی
خالی صفوں میں اور سوا اِستری ہوئی

بیجاں تھا جس پہ سایہ فگن وہ پری ہوئی
پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل بھی ڈری ہوئی

آنچ اُس کی قہر تھی کوئی کیونکر لگ نہ جائے
چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اُسکی لگ نہ جائے

پلٹی اُدھر سے جب تو اِدھر کا پرا نہ تھا
کاٹے تھے سر پہ فرق برش میں ذرا نہ تھا
چھٹکا ہوا تھا سم بدن اُس کا ہرا نہ تھا
خوں سب کا پی گئی تھی مگر دم بھرا نہ تھا

سیل فنا تھا جنگ میں کاٹ اُسکی دھار کا
دم خم تھا گھاٹ باڑھ میں سب ذوالفقار کا

گورا وہ ہاتھ اور وہ تلوار کی چمک
تھی صاف تیغ حیدرِ کرار کی چمک
موجوں پہ عکس ڈالتی تھی دھار کی چمک
اُس پار تک پہنچتی تھی اس پار کی چمک

اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں
خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم فرات میں

بے سر تھا جس کے فرق پہ وہ جا نگزا لگی
اک آگ تھی کہ چرخِ بریں میں جا لگی
چار آئینہ پہ ضربتِ قہرِ خدا لگی
کڑیاں کھلیں زرہ کی جب اُس کی ہوا لگی

برپا تھا شور چار طرف بھاگ بھاگ کا
پانی اثر دکھاتا تھا لوہے میں آگ کا

بڑھ بڑھ کے چل رہی تھی جو تلوار چار سو
کشتوں کے بڑھتے جاتے تھے انبار چار سو
تھا رن میں گرم موت کا بازار چار سو
پھرتا تھا جھوم جھوم کے رہوار چار سو

تیغ آئی جس پہ اُس کا بھی وار اُس پہ چل گیا
وہ سر گرا گئی تو یہ لاشہ کچل گیا

ہر اک علم کی چوب ضلالت نشاں کٹی
مُنہ تیغ کا کٹا تو سناں کی زباں کٹی
ترکش کٹے قلم ہوئے نیزے سناں کٹی
ٹکڑے ہوئی زرہ کمر پہلواں کٹی

روحوں کے ساتھ تن تھے نہ رد جیں تنوں کے ساتھ
تارِ نفس بھی کٹ گئے تھے گردنوں کے ساتھ

ناری صفوں میں جل گئے جب شعلہ ور ہوئی
چمکی اِدھر یہ تیغ تجلی اُدھر ہوئی

شب کو چمن کھلا جو سپر خوں سے تر ہوئی
سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی

چلائی موت صدقے تری کج ادائی کے
بولی نکل کے روح نثار اس لڑائی کے

جب سن سے فوج کفر پہ وہ جنگجو چلی
گویا سموم قہر خدا چار سو چلی

بسمل پھڑک کے رہ گئے بوں تند خو چلی
ٹکڑے اڑا دئے دو کیا سر خرو چلی

غل تھا برش ہے قہر کی جوہر بلا کے ہیں
رم بھر میں فیصلہ یہ کر شمے قضا کے ہیں

جس کی گلے سے مل کے چلی مر کے رہ گیا
بسمل بھی تیغ تیز کا دم بھر کے رہ گیا

آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا
سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا

دو پتلیاں بھی بہر تماشا تلی رہیں
سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں

کہنی سے دونوں ہاتھ جدا تن سے سر جدا
ہر نخل قد کی شاخ جدا اور ثمر جدا

اس ہاتھ سے جو تیغ تو اس سے سپر جدا
بھائی سے بھائی اور پسر سے پدر جدا

وہ تہلکے بھی ہول قیامت سے کم نہ تھے
کیا تفرقہ پڑا تھا کہ اعضا بہم نہ تھے

اسوار کو گرا کے سنبھلنے نہ دیتی تھی
لاکھوں میں ہاتھ ایک کا چلنے نہ دیتی تھی

برچھیت کو پرے سے نکلنے نہ دیتی تھی
رستم بھی ہو تو ٹھاٹھ بدلنے نہ دیتی تھی

جو اس کا کام تھا سو وہ پھرتی کے ساتھ تھا
جس کا قدم بڑھا نہ سپر تھی نہ ہاتھ تھا

اٹھی چلی سپاہ میں آئی جدا ہوئی
پنجہ جو بچ گیا تو کلائی جدا ہوئی

صف کی جدا پرے کی صفائی جدا ہوئی
پیری جگر میں خوں میں نہائی جدا ہوئی

دم توڑے یا مرے کوئی پروا ذرا نہ تھی
نکلی جو خوں میں پیر کے پھر آشنا نہ تھی

چھپتی تھی برق اُسکی چمک دیکھ دیکھ کے
رہ جاتی تھی سما کو سمک دیکھ دیکھ کے
تھراتا تھا زمیں کو فلک دیکھ دیکھ کے
خورشید کانپتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے

جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کی جال کا
بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

سب سے جدا تھی تیغ کے چلنے کی قطع راہ
اس صف کے ہاتھ پاؤں قلم وہ پر اتباہ
خط جا بجا تھے خاک پہ ماہین رزمگاہ
کٹ کٹ کے تیغیں کہتی تھیں اللہ کی پناہ

کترا کے لو پھر آئی لہو چاٹتی ہوئی
چلتی ہے یہ تو راہ کو بھی کاٹتی ہوئی

حضرؑ کی تلوار

کس صف پہ چلی تیغ کہ آفت نہ دکھائی
کس غول پہ چمکی کہ قیامت نہ دکھائی
کس کس کو پری بن کے شرارت نہ دکھائی
جلوہ کیا سو بار پہ صورت نہ دکھائی

پھل اُس کا نظر بندیٔ اعدا پہ تلا تھا
اس میں کوئی پردہ نہیں منہ صاف کھلا تھا

بے سر نظر آیا وہ جسے پا گئی شمشیر
دم بھر میں لہو خاک پہ برسا گئی شمشیر
چمکی تو اُدھر اور اِدھر آ گئی شمشیر
کیا منہ تھا کہ فولاد کو بھی کھا گئی شمشیر

سکتہ تھا ہر اک دل پہ عجب ضرب پڑی تھی
پر زے کیا اُس کو بھی زرہ لاکھ کڑی تھی

جو دشمن دیں تھا اُسے پہچانتی تھی وہ
مغفر کو حباب لب جو جانتی تھی وہ

چار آئینہ نہ وہ خود کو کب مانتی تھی وہ
ہر وار میں جوشن کا جگر چھانتی تھی وہ

اثر در تھا کہ تلوار تھی دم تھا کہ ستم تھا
تابیں تھیں کہ گھر موت کا پانی تھا کہ سم تھا

بیحال عدو ہول کے مارے نظر آئے
جو گھاٹ پہ تھے گور کنارے نظر آئے
جب سن سے چلی صاف شرارے نظر آئے
جوہر کبھی چمکے تو ستارے نظر آئے

اُس تیغ کا پھل کھا کے عدو نخچیر طپاں تھے
جب سامنے تیغ آگئی سب پھول خزاں تھے

گہ خلق کے نزدیک کبھی دل کے برابر
رن میں کوئی زخمی کوئی ساحل کے برابر
پانی میں اثر زہر ہلاہل کے برابر
بسمل بھی نظر آتا تھا بسمل کے برابر

سر پر تھی وہ جب تک کہ عدو راہ عدم لے
کیا دخل جو بیدم لئے دم بھر کہیں دم لے

شمشیر حسینی

کھنچ آئیں صفیں کھنچ کے جو دم تیغ نے کھینچا
سب فوج کو مابین شکم تیغ نے کھینچا
سر کے جو قدم سوئے عدم تیغ نے کھینچا
ہر فرد کے چہرے پہ قلم تیغ نے کھینچا

غل تھا کہ برستی ہوئی آتش نہیں دیکھی
یہ کاٹ یہ کس بل یہ کشاکش نہیں دیکھی

سر تن پہ کسی ظالم خودسر کے نہ چھوڑا
منفر کو سلامت کسی افسر کے نہ چھوڑا
زندہ کسی جرار کو لشکر کے نہ چھوڑا
تھا کون سا یکتا جسے دو کر کے نہ چھوڑا

مارا جسے دوزخ کو وہ راہی نظر آیا
چورنگ سپاہی پہ سپاہی نظر آیا

ہر ضرب میں گیتی کو ہلا دیتی تھی شمشیر
خود آئینۂ تن کو جلا دیتی تھی شمشیر

مُنہ ناریوں کے مُنہ سے ملا دیتی تھی شمشیر
پانی میں کفِ مار پلا دیتی تھی شمشیر

زہر اُس کا چڑھا جس پہ وہ سبل نظر آیا
فولاد کا جوہر سم قاتل نظر آیا

لوہے کی سپر کاٹ کے دستانے میں پہنچی
دو کر کے سپر خود کے پیمانے میں پہنچی

عرض سر و گردن سے چلی شانے میں پہنچی
شانے سے بڑھی روح کے کاشانے میں پہنچی

مجروح جو بھاگے تھے اُدھر فوج عدو کے
جنگل کی طرف دو نگڑے پڑتے تھے لہو کے

کاٹا اُسے جس تیغ سے میدان میں لڑی تیغ
ٹکڑے ہوا چار آئینہ جس کے وہ پڑی تیغ

بکتر میں نہ اُلجھی نہ چھلتے میں اڑی تیغ
زرہوں کو کیا چاک یہ تھی مُنہ کی کڑی تیغ

دو کرتی تھی وہ ہر کس و ناکس کو یہ کس تھا
اک ہاتھ میں فارس تھا نہ زیں تھا نہ فرس تھا

مشہور تھی وہ رشک پری قاف سے تا قاف
جوہر تھا جواہر کا کہ تھا زیور شفاف

سر سے گئی تا صدر شکم سے گئی تا ناف
پھر دیکھو تو لب خشک زباں پاک دہن صاف

ٹپکا جو لہو مُنہ سے شرارے نظر آئے
دریا سے گہر ابر سے تارے نظر آئے

کشتہ تھا ہر اک تیغ کے بے یافتہ پن کا
عریاں تھی مگر ہوش نہ تھا کچھ سر و تن کا

گرتا تھا لہو چھٹ کے نہ جوہر کے چمن کا
ابلی ہوئی تھی رنگ ٹپکتا تھا بدن کا

سب جسم بہبو کا تھا حرارت تھی غضب کی
کفار کو کھپوں کا تھا شرارت تھی غضب کی

علی اکبرؓ کی جنگ

تھم تھم کے یوں گیا صفِ اعدا پہ وہ دلیر
جاتا ہو دانوں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر

غازی جو بھوک پیاس میں تھا زندگی سے سیر
کشتوں کے پشتے ہو گئے دم میں سروں کے ڈھیر

اک سیل زور و شور سے آئی گذر گئی
ثابت نہ یہ ہوا صفِ اول کدھر گئی

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی
چار آئینہ کٹا زرہ خیرہ سر کٹی

نیزے کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی
سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی

رہوار بھی دو نیم میانِ مصاف تھا
ان سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں
چلے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں

نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں
جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں

اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چکی گری اٹھی ادھر آئی اُدھر گئی
خالی کہ پُر ہے تو صفیں خوں میں بھر گئی

کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

الدر سے دو آبہ تیغ دو دم کا کاٹ
آفت تھی جس کی باڑھ قیامت تھا جس کا گھاٹ

مقتل سے تا بہ نہر تھا دریائے خوں کا پاٹ
ہر دم تھی اُس کو تازہ لہو چاٹنے کی چاٹ

سختی کو جوڑ بند کے کب مانتی تھی وہ

ہر استخواں کو مغز قلم جانتی تھی وہ

آئی جدھر لپٹ کے صفوں کو بچھا گئی
تن سے اڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی
ہر اک کڑی کو زم سمجھ کر چبا گئی
فولاد کی زرہ کو اشارہ میں کھا گئی

چار آئینہ کا کاٹ اسی پر حوالہ تھا
ذکر اُس کا کیا ہے خود تو منہ کا نوالہ تھا

یارا فرار کا تھا نہ صورت فرار کی
پیدل کی موت تھی تو خرابی سوار کی
روئیں تنوں کو تاب نہ تھی ایک وار کی
ٹکڑی ہو تھے دو کے ہاتھ یہ گھائی تھی چار کی

آگے بڑھے تو منہ وہیں کٹ جائے گیو کا
بجلی کی تھی کڑک کہ طمانچہ تھا دیو کا

زندہ کسی کو تیغ دو دم چھوڑتی نہ تھی
پیاسی یہ تھی کہ جسم میں دم چھوڑتی نہ تھی
بے دم لئے گلا کوئی دم چھوڑتی نہ تھی
بھاگیں کہاں کہ موت قدم چھوڑتی نہ تھی

خود وہ دبے جو لڑتے تھے گھوڑوں کو داب کے
بیڑی قدم میں بن گئے حلقے رکاب کے

حضرت عباسؓ کی تلوار

سو سو ہوئے بڑھ صف دشمن پہ جب آئی
غل تھا نہیں بچنے کا اجل سب کی اب آئی
اتنی تو صدا آئی کہ برق غضب آئی
پر یہ نہ کھلا کب گئی اور سر پہ کب آئی

افتادہ تھے بے سر جو پرے فوج لعیں کے
سطریں سی نظر آتی تھیں صفحے پہ زمیں کے

ترچھی جو پڑی زیر بغل فرق سے نکلی
منہ غرب کی جانب جو گیا شرق سے نکلی
یوں جا کے تن ظالم بد رزق سے نکلی
العظمۃ للہ کی صدا برق سے نکلی

ہتیار گرے پڑتے تھے ثابت قدموں کے
سمٹے ہوئے تھے ڈر سے پرے علموں کے

دکھلا کے گلِ زخم بدن سے نکل آئی
شمشیر خزاں تھی کہ چمن سے نکل آئی
ہمراہ لئے روح کو تن سے نکل آئی
نس سے جو پڑی سر پہ تو سن سے نکل آئی

سرکش تھا تکبر سے جب افلاک پہ سر تھا
جھپکی تھی اُدھر آنکھ ادھر خاک پہ سر تھا

مغفر میں ہوئی غرق تو سر کاٹ کے نکلی
روکا جو سپر پر تو سپر کاٹ کے نکلی
شانے پہ گری تابہ کمر کاٹ کے نکلی
سینے میں در آئی تو جگر کاٹ کے نکلی

ہر ہاتھ میں گردش تھی نئی ڈھنگ نیا تھا
گھوڑے کی بھی ٹکڑی تھے یہ چوزنگ نیا تھا

حضرتِ عباسؓ کا علم

غازی کی وہ شوکت وہ شکوہِ علمِ نور
کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطور انا الطور
پرچم تھا کہ بکھرے ہوئے تھے موئے سرِ حور
ہم پنجہ ہو پنجہ سے ہے کیا مہر کا مقدور

سب فوج ملائک کی نظر اُس پہ لڑی تھی
اوڑھے ہوئے اک سبز ردا خور کھڑی تھی

حضرت عباسؓ کی تلوار

خاک اڑگئی اُس صف کی جدھر سے چلی وہ
خود و سر و رو کاٹ کے جوشن سے چلی وہ
اسوار کا گزرا تھا کہ توسن سے چلی وہ
دو کر کے زرہ سینۂ دشمن سے چلی وہ

تھی ریت میں جب توسن چالاک سے نکلی

کھینچا تو چمکتی ہوئی بس خاک سے نکلی

کٹ جاتی تھے مُنہ دیکھ کے سب تیغزن اُسکا
تاریک زمیں اور وہ تاباں بدن اُس کا

قامت میں کجی چال میں وہ بانکپن اُسکا
چلتی تھی سروں پر یہ نیا تھا چلن اُس کا

بجلی کو بھی تڑپا دیا تھا جلوہ گری نے
ناب اُس کی نہ تھی مانگ نکالی تھی پری نے

غل تھا یہ کسی تیغ میں چم خم نہیں دیکھا
لشکر کا لہو پی گئی یہ دم نہیں دیکھا

بجلی کی تڑپ کا بھی یہ عالم نہیں دیکھا
ایسا کسی ناگن میں بھی سم نہیں دیکھا

ہے دور سے برچھی تو برابر سے چھری ہے
سچ کہتے ہیں تلوار کی بھی آنکھ بڑی ہے

اک آفت نو لشکر سفاک پہ آئی
جس صف پہ گری تیغ وہ صف خاک پہ آئی

گہ فرق پہ چمکی کبھی فتراک پہ آئی
دو ہو گئے جس ظلم نما پاک پہ آئی

ہر صف کا یہ احوال تھا اُس تیغ دو دم سے
جس طرح کوئی کاٹ دے سطروں کو قلم سے

سالم صف ہیجا میں کسی سر کو نہ چھوڑا
سر کیا ہے کہ بے دوکے پیکر کو نہ چھوڑا

جوشن کو کمر بند کو بکتر کو نہ چھوڑا
چار آئینہ کو ڈھال کو مغفر کو نہ چھوڑا

لوہے کے چبانے کی صدا بھا گئی اُسکو
جس پیر پہ منہ ڈال دیا کھا گئی اُسکو

ذوالفقار

وہ غیض وہ غرہ وہ چمکتی ہوئی تلوار
گویا تھا مجسم غضب حضرت قہار

اتنا تو پکارے کہ خبردار خبردار
ڈر الیسا نہ اٹھی تھیں کہ گری برق شرر بار

گرمی سے ہوا میں شرر اڑتے نظر آئے
جھونکا تھا غضب کا کہ سر اڑتے نظر آئے

اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ فشاں برق
وہ برق کہ خود مانگتی تھی جس سے اماں برق
یاں موج تو واں سیل جو یاں ابر تو واں برق
مسند زہر رش قہر بدن آگ زباں برق

سرکش تھا جو ناری یہ جلاتی تھی اسیکو
لوٹے پہ جو گرتی تھی تو کھاتی تھی اسیکو

اٹھ کر کبھی بیٹھی کبھی بچکی کبھی تیکی
سر گرگٹ گردن جدھر اس تیغ نے خم کی
سیدھی صف دشمن کو ملی راہ عدم کی
سیفی تھی کہ گویا دم شمشیر دم کی

دم بھر میں جو تیغیں صاف تھیں بیدادگروں کی
تھی میغ کی طرح خاک پہ بوچھار سروں کی

اک ضرب میں ہاتھ اسکے جو آیا سر اس کا
شاخیں گئیں اس تخل ستم کی ثمر اس کا
دل اس کا دو پارا کیا کاٹا جگر اس کا
دم ہو گیا آخر ادھر اس کا ادھر اس کا

تھی سم کی حرارت جو بدن اس کا ہرا تھا
افعی کی طرح پیٹ میں کیا زہر بھرا تھا

تھا دور تلک خون سے اس تیغ کے رنگ سرخ
پھولا ہوا تھا تیغ کا اک پھل سے چمن سرخ
چہرے تو سیہ کاروں کے تھے زرد بدن سرخ
تھی تیغ دو پیکر کی زباں سرخ دہن سرخ

بے وجہ نہ منہ لال تھا اس عربدہ جو کا
بیڑہ دیا اٹھائے ہوئے تھی خون عدو کا

مغفر سے جھلم کٹ گئی گردن میں در آئی
گردن سے سر کٹا تھا کہ جوشن میں در آئی
جوشن سے گزرتا تھا کہ بس تن میں در آئی
تن سے ابھی اتری تھی کہ توسن میں در آئی

بچتا کوئی کیا تیغ قضا رنگ کے نیچے

اک برق غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

قبضہ تھا کہ تھا چہرہ پُر قہر قضا کا
نا بیں تھیں کہ دھارا تھا وہ دریائے فنا کا
باڑھ ایسی کہ رُخ پھر گیا دریا کی گھٹا کا
پشتہ وہ کہ پی جائے لہو اہل جفا کا

تمغے کی جگہ یا اسد اللہ لکھا تھا
جوہر میں انا سیف ید اللہ لکھا تھا

پیری کبھی گہہ خوں میں نہا کر نکل آئی
ٹھیری کبھی غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ موج میں جا کر نکل آئی
منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی

کیا ڈر اُسے طوفاں کا جو چالاک ہوا ایسا
جب باڑھ پہ دریا ہو تو پیراک ہوا ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا
نیزے پہ جسے ناز تھا سر اُس کا قلم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر نہ افعی میں یہ سم تھا
یہ فتح کی جو یا تھی قداس واسطے خم تھا

بد اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحب جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

جب شعلۂ سرکش کی طرح فوج پہ لپکی
تصویر نظر آگئی بجلی کے تڑپ کی
تھرائے جگر آنکھ ستمگاروں کی جھپکی
سر اُڑ گئے اور خون کی اک بوند نہ ٹپکی

جب ہاتھ اٹھا چرخ پہ سر جھک گیا اُسکا
پی پی کے لہو اور بھی دم بڑھ گیا اُسکا

حضرت کی تلوار

حشر برپا تھا کہ تیغ حرز یجاہ چلی
آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
کس کرشمہ سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی
گہہ بڑھی گاہ پھری گاہ تھمی گاہ چلی

زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

پھونکے بجلی کو یہ اوس آگ کی ہے پرکالا
کاٹ جائے تو کبھی لہر نہ لے پھر کالا

برچھیاں چل گئیں اُس پر جسے دیکھا بھالا
آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

اس کے پانی میں کفِ مارِ سیہ گھولا ہے
باڑھ ہے یا ملک الموت نے مُنہ کھولا ہے

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی
ہاتھ مُنہ صدر و کمر گردن و سر کاٹ گئی

چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں چاٹ گئی
دیکھی تیغوں کی جدھر باڑھ اُسی گھاٹ گئی

جس پہ جاتی تھی نہ بیجان کئے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی

گل نئے پھولے جو برچھی پہ لگا پھل اُسکا
زور دکھلاتا تھا ہر ضرب میں کس بل اُس کا

ڈھیر تھا خاک پہ کاٹا ہوا جنگل اُس کا
جوڑ ہا جنگ میں قصہ ہوا فیصل اُس کا

شور تھا دیکھئے کیونکر یہ بلا ٹلتی ہے
اس قدر جلد تو سیفی بھی نہیں چلتی ہے

کثرتِ جوہرِ ذاتی سے وہ گو جال میں تھی
پر تڑپ صورتِ ماہی وہی ہر حال میں تھی

تھی چمک جا ذمیں بجلی تو پری چال میں تھی
کبھی مغفر میں کبھی سر میں کبھی ڈھال میں تھی

کبھی دم لینے کی مہلت تھی نہ بسمل کے لئے
تھی جگر کے لئے برچھی تو چھری دل کے لئے

خم وہ پایا تھا کہ شرمائے ہلالِ مہ عید
حر کے ہاتھ آگئی تھی گلشنِ جنت کی کلید

برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید
جامۂ کفر کے پرزے بھی ہوئے قطع و برید

نہ بچا تا رِ نفس خلق میں جینے کے لئے

جو اک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لئے

کئے تلے کئی پہیم جو کماندا روں پر
چل گئے تیر ملامت کے جفا کاروں پر

چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں سوفار و پر
رخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پر

جل کے خرمن ہوا یوں خاک کہ خوشہ نہ ملا
کشمکش میں کہیں چیونٹی کو بھی گوشہ نہ ملا

میر انیس کے رخش قلم کی جولانیاں

تلوار کے بعد گھوڑے کو دیکھئے کہ میر انیس نے تعریف میں کیا کام کیا ہے اور ایک مضمون کو کتنی طرح سے باندھا ہے۔ جس سے شہیدان کربلا کے گھوڑے براق و رفرف سے بھی چار قدم آگے نکل گئے ہیں۔

گھوڑا ۱

وہ شہسوار اور وہ صفدر کہ نام سے نور
بائی کبھی صبا نے نہ جسکے قدم کی گرد

بازار برق گرمرو دانی سے اس کی مد
تھا چال میں پری تو چھلاوہ دمم نبرد

اس کی سبک روی سے خجالت سحاب کو
دریا پہ جائے اور نہ خبر ہو حباب کو

گھوڑا ۲

صرصر سے تیز تر تھا وہ اسپ جسور فر
تھا یکساں اس کو صورت خورشید دشت و در

پانی پہ تھا جو موج تو آتش میں تھا شرر
گیتی نورد و برق تگ و آسماں سفر

پاؤں سے سرکشوں کی صفیں پائمال تھیں

زیں آفتاب تھا تو رکا ہیں ہلال نہیں

طے کی جو راہ بجز تو برق سے نکل گیا
مانند تیر لشکر شر سے نکل گیا
آیا اُدھر سے گر تو اِدھر سے نکل گیا
پستلی کی گرد پھر کے نظر سے نکل گیا

سرعت میں تھا ہرن تو دغا میں ہزر تھا
پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا

گھوڑا

فرما کے یہ گھوڑے کو جو رانوں میں دبایا
شبدیز نے نظر کیا کہ ہوا نے بھی نہ پایا
رو باہوں کے انبوہ پہ اک شیر سا آیا
الدری سرعت کہ ہرن ہو گیا سایا

غل تھا کبھی یوں آگ سے پارا نہیں اُڑتا
اس شان سے جنگل میں چکارا نہیں اُڑتا

کیجے جو خیال آنکھ میں بجلی سی چمک جائے
یوں فکر منجم بھی نہ پائے فلک جائے
ساتھ اُس کے خیالِ شعرا دوڑ کے تھک جائے
چتون وہ کہ شیر دلکی نگہ اُس سے جھپک جائے

شیہہ جو وہ کرتا تھا تو ہٹ جاتے تھے گھوڑے
ہر صف میں الف ہو کے لپٹ جاتے تھے گھوڑے

مشرق سے جو راکب اُسے ہاں کہہ کے اُڑائے
عقل حکما دنگ ہو سرعت وہ دکھائے
ہے سے الف ہاں ابھی یاں وصل نہ پائے
مغرب سے یہ خورشید فلک جا کے پھر آئے

دھوکا پرِ پرواز کا ہے دامنِ زیں پر
طاؤس ہوا پر ہے تو بجلی ہے زیں پر

ہیں صانع قدرت نے کھل سانچے میں ڈھالے
ہو پیار سے گر بیں عناں ہاتھوں کو ڈالے
کہتے ہیں رکابوں کو جو ہیں دیکھنے والے
ہیں دو مہ نو زیں کے دامن کو سنبھالے

گردن پہ عجب حسن سے یال اُسکے پڑی ہو
گویا کہ پری کھولے ہوئے بال کھڑی ہے

یہ تا حدِ امکاں صفتِ عقل رسا جائے
بالائے فلک صورتِ شبدیز دعا جائے

کہسار سے دریا کی طرف مثلِ صدا جائے
دریا پہ جو دوڑاؤ تو مانندِ ہوا جائے

سیر اُس کی اگر چشم کو منظورِ نظر ہو
آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پتلی کو خبر ہو

اڑ جانے میں رنگِ رُخِ عاشق سے سبک خیز
کاکل وہ کہ زلفِ سرِ لیلیٰ سے دل آویز

پوئی میں غزالوں کی طراروں سے کہیں تیز
آقا کے ارادہ کو سمجھتا تھا وہ مہمیز

جوں سایۂ آہو نہ قرار اُس کو کہیں تھا
راکب نے جدھر آنکھ سے دیکھا یہ وہیں تھا

گھوڑا

ہلچل وہ اُن صفونکی وہ گھوڑے کی جست خیز
تھا ترک تازیں کہیں صرصر سے تند و تیز

صدقے گندھے ایال پہ گیسوئے مشک بیز
گرد آوری میں ابر تو بجلی دم ستیز

ذرے قدم کے فیض سے سارے چمک گئے
جب تپلیاں اُٹھیں تو ستارے چمک گئے

جرات میں رشک شیر تو ہیکل میں سلیتن
پوئی کے وقت کبک دری جست میں ہرن

بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

آنکھیں وہ جنکو دیکھ کے حیران ہو غزال
گردن وہ جسکی شرم سے ہو سرنگوں ہلال

آہو کی جست شیر کی چتون پری کی چال
دل اُس کو دست و پائے حنائی سے پائمال

ہر نعلِ پا کا حُسن یہ تھا اُس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

دیکھی نہیں کسی نے یہ نرمی شتاب میں
سرعت کا اسکی وصف لکھیں گر کتاب میں

ہے جس کی زین صاف پہ مخمل بھی خواب میں
سطریں رہیں بہ صورتِ موجِ اضطراب میں

اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر

کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
کاوے میں شکلِ گنبدِ دوار پھیر لو

بجلی ہے جس طرف دمِ پیکار پھیر لو
نقطے کے گرد صورتِ پرکار پھیر لو

دوڑے بروئے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

طاؤس ساجد ہر گیا دم کو چنور کئے
کچلے کبھی بدن کبھی پامال سر کئے

دم میں پرے سیاہ کے زیر و زبر کئے
کشتوں کو روندروند کے سم خونیں تر کئے

میداں میں تھا کسی کو نہ یارا ستیز کا
عالم ہر ایک نعل میں تھا تیغ تیز کا

زیبا ہے گر کہیں شعرا باد پا اُسے
آہستہ گر چلے تو نہ پائے ہوا اُسے

طائر جناں کے جانتے ہیں سب ہوا اُسے
مہمیز و تازیانہ کی حاجت ہو کیا اُسے

فتراک گر ہوا سے کبھی اک ذری اڑی
یوں اڑ گیا کہ سب نے یہ جانا پڑی اڑی

گھوڑا

تھا زینِ فرس رحل تو قرآں شہ والا
وہ تخت ہوا تھا تو سلیماں شہ والا

وہ دوش صبا بوے گلستاں شہ والا
وہ برج شرف نیر تاباں شہ والا

بو گل کی نسیم سحری لیکے چلی ہے
غل تھا کہ سلیماں کو پری لیکے چلی ہے

ضیغم کی جو تھی جست تو آہو کے طرارے
ہر نعل سے خم تھا مہ نو شرم کے مارے

آنکھوں کو چراتے تھے خجالت سے چکارے
اٹھتے تھے قدم جب تو چمکتے تھے ستارے

ہو رشک نہ کیونکر فلک ماہ جبیں کو
نقش سم توسن سے لگے چاند زمیں کو

عونؓ و محمدؓ کے گھوڑے

گھوڑے تھے چھلاوہ کبھی یاں تھے کبھی واں تھے
پتلی میں تو پھرتے تھے پر آنکھوں سے نہاں تھے

یاں تھے جو سکندر تو اودھر گرم عناں تھے
چھلی تھے کسی جا تو کہیں آب رواں تھے

ہو سکتی تھی مچھلی سے یہ سرعت نہ ہرن سے
جھونکے تھے ہوا کے کہ نکل جاتے تھے سن سے

سرعت تھی سمندی کی وہ تھی پل کی طرارے
چھپتے تھے پہاڑوں میں ہرن شرم کے مارے

سم ایسے کہ قدموں پہ فلک مدر کو وارے
جب نعل کھلیں چار ہلال اور اتارے

اڑ جانے کو افلاک پہ طیار رہی تھے
کیلوں سے یہ ثابت ہے کہ سیار رہی تھے

رخش علی اکبرؓ

جب کود کر سمند یہاں سے وہاں گیا
ثابت نہ کچھ ہوا کہ ہوا آیا کہاں گیا

جھاڑیں جو تپلیاں تو نظر سے نہاں گیا
گھوڑا براق بن کے سوئے آسماں گیا

نعل تھا وہ آکے دیکھ لیں بادپا کے پاؤں
دیکھے نہوں زمانہ میں جس نے ہوا کے پاؤں

سرعت میں شرمسار نسیم سحر ہوئی
آنکھوں میں پھر گیا نہ عزہ کو خبر ہوئی
تن سے عرق کی بوند جو ٹپکی گہر ہوئی
جب خاک اڑی ادھر تو دم اسکی چنور ہوئی

گھوڑا نہ کہئے تخت سلیماں روانہ تھا
اس کے لئے تو جنبش رگ تازیانہ تھا

باریک جلد وہ کہ خجل قاقم و حریر
مشکیں پر و ہما ہوئے رم خوردہ شیر گیر
حلقے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر
آتش مزاج بادیہ پیما فلک مسیر

یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اس راہوار کے
جیسے پیادہ چلتا ہے آگے سوار کے

تلوار تھی جو ابر تو گھوڑا بھی برق تھا
مثل عروس زیور خوبی میں غرق تھا
کچھ اس میں اور اس میں مطلق نہ فرق تھا
دو گام اس کو فاصلۂ غرب و شرق تھا

پاکھر تھی موتیوں کی عرق جسم پاک پر
آئی تھی بادتند فرس بن کے خاک پر

رخش علی اکبرؑ

باگ ہلنے کی نہیں اسپ فلک سیر کو تاب
ہو ذرا گرم تو اڑ جائے مثال سیماب
ڈالے کاوے پہ جو دریا میں بشکل گرداب
یہ سبک رو ہے کہ ٹوٹی نہ کبھی سم سے حباب

نہ زمیں زیر قدم غرب سے تا شرق رہے
رشک سے نعل در آتش ہی سدا برق رہے

امام علیہ السلام کا گھوڑا

آمد فرس کی تھی دُلہن آتی ہے جس طرح
تھم تھم کے نکہتِ چمن آتی ہے جس طرح
تصویر آہوئے ختن آتی ہے جس طرح
یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح

باہم طیور کہتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ مشک پری ہے یہ

آیا عجب شکوہ سے اسپ قمر رکاب
تھامے تھی فتح زین کا دامن ظفر کا باب
چشمک زنی ہلال پہ کرتی تھی ہر رکاب
حلقہ تھا نور مہر کا یا جلوہ گر رکاب

فتراک تھے کہ کھولے ہوئے تھا عقاب پر
زیں پر تھا ابر پوش کہ ابر آفتاب پر

اخگر خجل ہیں زین جواہر نگار سے
ذرّوں نے چن لئے ہیں ستارے غبار سے
تھمتا تھا کب سوار فراست شعار سے
گردن میں ہاتھ باگ نے ڈالے ہیں پیار سے

نازاں ہیں خود رکاب کے پائے کو دیکھ کر
بل کر رہا ہے خاک پہ سائے کو دیکھ کر

قربان اُس نگاہ رضیع شکار کے
پامال کر دے شیر کو ٹاپوں سے مار کے
شایستگی کو پوچھ لو دل سے سوار کے
چاہے تو ایک طفل چڑھے باگ اُتار کے

رکھ دے قدم تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا
پیارا فرس ہے راکبِ دوشِ رسول کا

چاروں سموں سے بدر خجل نعل سے ہلال
کھیلیں شکار شیر یہ آنکھیں ہیں وہ غزال
کہئے نہ یال حور نے بکھرا دیئے ہیں بال
پھرنے پہ جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال

رستے ہیں یاد گنبد نیلی رواق کے

ولدل کی تیزیاں ہیں طرارے براق کے

سینہ کشادہ تنگ کمر چست جوڑ بند
گردن میں خم ہلال کا اور اُس پہ سر بلند
جاندار یُورِ بار عدو کش ظفر پسند
بجلی کسی جگہ کہیں آہو کہیں پرند

سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے

دونوں کنوتیاں جو بہم ہیں بشکل لا
سوچیں تو اہل بزم کہ مطلب ہے اسکا کیا
ہاں ببر زباں ہے گو پہ یہ کہتا ہے برملا
آقا ہے میرا صاحب لاسیف ولا فتا

افسوس اہل شام کو کچھ پیش و پس نہیں
آقا حسینؑ سا نہیں مجھ سا فرس نہیں

حر کا گھوڑا

گھوڑا وہ برق تھا کہ جو راکب اُسے دبائے
افلاک پر سمند نظر کی طرح سے جائے
اُسکے قدم کی گرد کو صرصر کبھی نہ پائے
پیک خیال و وہم یہ سرعت کہاں سے لائے

جس غول پر گرا تو اُڑا اس شکوہ سے
پرواز کبک کرتا ہے جس طرح کوہ سے

رخش عباسؓ

آیا سجا ہوا وہ براق سمند سیر
تھا خود فلک پہ اُڑنے کو طیار مثل طیر
ہوتا تھا اُس کے ڈر سے غزالوں کا حال غیر
الحق سپاہ شر اُسے روکے تو یہ بجیر

صرصر قدم کے گرد کو پاتی نہیں کبھی
ڈھونڈے بشر پری نظر آتی نہیں کبھی

وہ زیب و زین زین کی وہ ساز وہ پھبن
زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دلہن
چشم سیاہ دیدہ آہو پہ طعنہ زن
سرعت یہ تھی کہ بھولتے تھے چوکڑی ہرن

جادو تھا معجزہ تھا پری تھا طلسم تھا
پاکھر نہ تھی زرہ تھی تہمن کا جسم تھا

رکھا قدم رکاب میں حیدر کے لال نے
نعلین پاکو فخر سے چوما ہلال نے
بخشی جو صدر زین کو ضیا خوش جمال نے
دم کو چنور کیا فرس بے مثال نے

کس ناز سے وہ رشک غزالِ ختن چلا
طاؤس تھا کہ سیر کو سوئے چمن چلا

خوشبو سے ارضِ پاک ریاضِ جناں بنی
گرد اڑ کے غازۂ رخ لیلیٰ وشاں بنی
جلوے سے راہ دشت بلا کہکشاں بنی
نقشِ سمِ فرس سے زمیں آسماں بنی

سم بدر تھے تو نعل بھی چاروں ہلال تھے
نقشِ اسمِ فرس سے ہزاروں ہلال تھے

حر کا گھوڑا

رہوار کی وہ چال وہ تلوار کا چلنا
بھاگڑ وہ پیادوں کی صفوں کا وہ کچلنا
غصے میں وہ شبدیز کی آنکھوں کا اُبلنا
کف مُنہ سے گرا کر وہ کنوتی کا بدلنا

مارا تھا قدم اُس نے شجاعت کے چلن پر
یوں گھوڑے پہ جاتا تھا اسد جیسے ہرن پر

لڑنے میں سمجھتا تھا فرس دل کا اشارا
رہوار نے کچلا اُسے حر نے جسے مارا
وہ جست وہ چھلانگ وہ دپٹ اور وہ طرارا
مڑ دیں نظر شوخ کی اُڑنے میں چکارا

ایسا تو سبک رو فرس برق سفر ہو
پشلی پہ ہو پشلی تو نہ آنکھوں کو خبر ہو

حضرت عباس کا گھوڑا

کہہ کر یہ بات باگ اُٹھائی سمند کی
صورت بدل گئی فرس سربلند کی

چھل بل ہرن کی تیز پری تھی پرند کی
سرعت بلائیں لیتی تھی ہر جوڑ بند کی

بجلی چمک کے چھپ گئی پارا تڑپ گیا
جنگل میں یوں اُڑا کہ چکارا تڑپ گیا

مرکب قدم زمیں پہ نہ رکھتا تھا ناز سے
بجلی کو خوف کیا ہے نشیب و فراز سے

چالاکیاں دکھاتا تھا کس امتیاز سے
اڑتا تھا پر صدا نہ نکلتی تھی ساز سے

راکب وہ ہیں جو فخر دو عالم کی تاج ہیں
گھوڑا بھی جانتا ہے کہ نازک مزاج ہیں

وہ تھوتھی وہ اُبلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال
گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال

وہ جلد وہ دماغ وہ سینہ وہ سم وہ چال
دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال

وہ قصر آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر اگر خدا اُسے دیتا براق تھا

وہ رشک صبا خاک پہ کس طرح رکھے گام
گھوڑا
ہووے جو فلک سیر زمیں سے اُسے کیا کام

خوش قامت و خوش رو و خوش آغاز خوش انجام
تھا نعل در آتش کہیں دم بھر تھا نہ آرام

دھرتا ہوا لاشوں پہ قدم جاتا تھا گھوڑا
دامان جراحت کی ہوا کھاتا تھا گھوڑا

نعل آئینہ رنگ ایسے کہ الماس بھی شرمائے
برہم ہوا گر شکل و رنگ اُس میں نظر آئے

ہر دم جو گندھی چوٹیوں کا دام نہ الجھائے
فتراک کے پر کھولے ہوئے چرخ پہ اُڑ جائے

شش در ہوا فلک زمیں جواہر کی چمک
سم رکھ دے ابھی جا کے سر شیر فلک پر

علی اکبر کا گھوڑا

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خوں
گنڈے کو دیکھ کر مہ نو ہوئے سرنگوں

رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں ؛ غنچے بھی کچھ پڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں

قرباں ہزار جان فرس بے نظیر پر
سو فارد و چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر پر

وہ صاف صاف اُس کی کنوتی کمر کفل ؛ اللہ رے کشادگیِ سینہ و بغل
سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل ؛ پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل

راکب نے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تار نفس بھی اُس کے لئے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند ؛ سانچے میں تھی ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
سُم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند ؛ نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سر بلند

گر پل گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال ؛ کبکِ دری خجل دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی سے قدم کے تلے نہال ؛ اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

ہوا گیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا ؛ آیا عرق تو ابر گہر بار بن گیا
گہہ قطب گاہ گنبد دوار بن گیا ؛ نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا

حیراں تھے اُسکی گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

گھوڑے کی تعریف

سمٹا جا اڑا ادھر آیا اُدھر گیا ؛ چمکا پھرا اچھل دکھایا ٹھہر گیا

تیروں سے اڑکے جھپیوں میں بے خطر گیا
رہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اسکی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند
سُم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند

سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند

پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا
اُترا وہ برق بن کے پری ہو کے اُڑ گیا

جرات میں رشک شیر تو ہیکل میں سپلیتن
پوئی کو وقت کبک دری جست میں ہرن

بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آئے جائے میں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں ہو زلف حور سے خوشبو ایال کی
دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی

پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی
غصہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی

وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن یراق کا
دندل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے
بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے

سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے

وہ تھوتھنی کہ غنچہ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر

علی اکبرؓ کا گھوڑا

بجلی سا ہر اک صف سے نکل جاتا تھا گھوڑا
تھا سایہ زلف علی اکبرؓ اُسے کوڑا

سرکٹ کے گرا جسکا اُسے ٹاپ سے توڑا | ماتھے پہ لگے تیر پہ مُنہ اُس نے نہ موڑا

اڑتا ہوا یوں فوج کے انبوہ سے نکلا
معلوم ہوا کبک دری کوہ سے نکلا

یہ صف ہوئی پامال تو اُس صف میں در آیا | ظاہر اُس خیال اُس سے نہ سرعت میں برآیا
یاں سے جو گیا واں تو اُدھر سے ادھر آیا | نظروں نے چھپا گاہ تو گاہے نظر آیا

اڑنے میں مہک گل کی تن صاف سے آئی
ہر غول میں غل تھا کہ پری قاف سے آئی

حر کا گھوڑا

سُن کے یہ بک جولی اسپ سُبکتاز اُڑا | ڈر سے رنگِ عمرِ شعبدہ پرواز اُڑا
کیا اُڑا رخش کہ طاؤس بصد ناز اُڑا | دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اُڑا

باغ رضوان میں نسیم سحری جاتی ہے
غل تھا دربار سلیماں میں پری جاتی ہے

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند | حر شہ کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گرد سمند
کہتے تھے شرم سے وہ لیکے جو دوڑی تھے کمند | یہ چھلاوہ تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند

کیا سبک سوئے چمن بادِ بہاری پہنچی
ہم یہیں رہ گئے واں حر کی سواری پہنچی

گھوڑا

کل کی طرح اشارہ میں سو بار پھیر لو | بجلی ہے جس طرف دم پرکار پھیر لو
کاوہ میں شکل گنبد دوار پھیر لو | نقطہ کے گرد صورت پرکار پھیر لو

دوڑے بروئے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

غصے میں انکھڑیوں کے اُلٹنے کو دیکھیے
جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے

سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے

گردن میں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہو
بالا دوی میں اُسکو ہما پر بھی فوق ہے

تھم کر ہوا چلی فرس خوش قدم بڑھا
جوں جوں وہ سو سے دشت بڑھا اور دم بڑھا

گھوڑوں کی لیں سواروں نے باگیں علم بڑھا
رایت بڑھا کہ سرور یاض ارم بڑھا

پھولوں کو کے بادِ بہاری پہنچ گئی
بستان کربلا میں سواری پہنچ گئی

ارزق اور فرزندانِ ارزق سے حضرت قاسمؑ کی جنگ

فردوسی نے شاہنامہ میں مبارزوں کے انداز جنگ کی لاثانی تصویریں کھینچی ہیں تیر و کمان۔ تیغ و سنان کے چلنے کی صورتیں دکھائی ہیں لیکن میر انیس نے اردو میں جو کمال کیا اُس سے بھی زیادہ قابل تعریف ہے جو سیکڑوں جگہ مختلف حالتوں سے اظہار کمال کر رہا ہے یہاں ارزق کے چاروں بیٹوں کی جنگ اور اُن کی جنگ کے بعد خود ارزق کی نسبت کئی طرح سے حربات جنگ کا اظہار کیا ہے میں اُن میں سے چند بند لکھتا ہوں پہلے ارزق کا بڑا بیٹا مقابل ہوا

نیزے کا ستمگار نے آتے ہی کیا وار
قاسمؑ اُسے رد کر کے پکارے کہ خبردار

پھر گھوڑے کو چمکا کے جو آیا وہ جفا کار
بجلی سی اِدھر سے بھی چلی تیغ شرر بار

روکے کسے ظالم کبھی یاں تھی کبھی واں تھی
نیزے کو جو دیکھا تو نہ بوڑی نہ سناں تھی

تلوار کا ظالم نے کیا وار جھپٹ کر
خالی دیا اُس وار کو تو شاہ نے ہٹ کر

دولھا نے جو حربہ کیا گھوڑے کو ڈپٹ کر
دستانے بھی ساعد بھی گرے تیغ سے کٹ کر

حیران تھے قوت پہ ملک ابن حسنؓ کی
اس زور سے ٹپکا کہ زمیں ہل گئی رن کی

اُس کے بعد تین بیٹے اور حضرت قاسمؓ کے ہاتھ سے مارے گئے تب توارزق بڑے ہی جوش و خروش سے چنگھاڑتا ہوا نکلا اُس کی نسبت لکھتے ہیں

چاروں پسر ارزق کو نظر آئے جو بیدم
اک آگ عناصر میں بھڑکنے لگی اُس دم

طاری ہوا غصہ نہ ملی فرصتِ ماتم
باندھا کمر خس کو زنجیر سے محکم

بیٹے ہوئے سر بر جو نہ قتال عرب سے
آنکھیں ہوئیں دو کاسۂ خوں جوش غضب سے

آیا وہ ستمگار سجے اسلحہ تن پر
شانے پہ کماں رخ پہ چھلم فرق پہ مغفر

ترکش بھی دہن کھولے ہوئے صورتِ اژدر
بر میں تو زرہ اور کمر خس میں خنجر

کف غیظ سے منہ میں سخن سخت زباں پر
اک ہاتھ تو شمشیر پہ اور ایک عناں پر

نیزہ صفتِ مار زباں منہ سے نکالے
ترکش تھا کہ بانبی میں نظر آتے تھے کالے

تلوار کا منہ ایسا کہ فولاد کو کھالے
ڈھال ایسی کہ جو کوہ کو دامن میں چھپالے

گرز ایسا فلک خاک کا پیوند ہو جس سے
چار آئینہ وہ تیغ کا دم بند ہو جس سے

اور زیر زرہ پہنے تھا اس طرح کا بکتر
خنجر نہ اثر جس پہ کرے اور نہ جمدھر

زنجیر سے باندھے تھا کمر یوں وہ ستمگر
حلقے میں ہو جس طرح لئے کوہ کو اژدر

وہ رشکِ تہمن تو فرس پیل دماں تھا
اسوار نہ تھا کوہ پہ اک کوہ رواں تھا

چنگھاڑ کے صف میں صفت دیو پکارا
کس شخص نے بیٹوں کو مرے جان سے مارا

قاسم نے صدا دی کہ یہ ہے کام ہمارا
الفت ہے جو بیٹوں کی تو ہو معرکہ آرا

ان بازوؤں میں زور ہے خالق کے ولی کا
تو ارزق شامی ہے میں پوتا ہوں علی کا

اس کے بعد چند باتیں ہو کر لڑائی شروع ہو گئی۔

پرکار سے میدان میں پھرنے لگے مرکب
رد کر دیا نوشاہ نے وار اُس نے کیا جب

بند ھتا تھا کوئی بند نہ بنتا تھا کوئی ڈھب
جرأت میں ید اللہ یہ تھے اور وہ مرحب

اٹھتی تھی تہق گرد کی میدان بلا میں
چنگاریاں اڑتی تھیں سنانوں سے ہوا میں

نیزے تھے کہ دو مار نکالے تھے زبانیں
جن سے نہ بچیں رستم و سہراب کی جانیں

حملے تھے یہ شانوں سے نہ سر کی تھیں کمانیں
لڑ لڑ کے گریں خاک پہ نیزوں کی سنانیں

تھی زد جو کڑی ٹوٹ گئیں ڈانڈیں بھی لڑ کر
غصے سے مقابل ہوئے تیغوں کو پکڑ کر

بل کھا کے ستمگار نے غصہ سے کہا ہاں
قاسم نے کہا آ یہی گو ہے یہی میداں

بولا یہ اٹھا تیغ کو وہ دشمن ایماں
لے وار مرا روک تو اے کودکِ ناداں

تھی پاس سپر بھی پہ نہ اُس وار کو روکا
نوشاہ نے تلوار پہ تلوار کو روکا

چمکا کے وہی تیغ جو دشمن کو بتائی
ہٹنے کی بھی مہلت نہ ستمگار نے پائی

اک برق سی آنکھوں میں چمکتی نظر آئی
ظالم نے سپر سر کے بچانے کو اٹھائی

احسنت کا غل فوج کے انبوہ سے اٹھا
معلوم ہوا ابر سیہ کوہ سے اٹھا

یاں مغفر دشمن پہ گئی تیغ سپر سے
منفر کو جو کاٹا تو بڑھی کاسۂ سر سے

بجلی سی چمک کر اودھر آئی جو ادھر سے
گردن تھی جدا سینہ سے اور سینہ کمر سے

کیا ہاتھ جفا کار کو نوشاہ نے مارا
تھا شور کہ مرحب کو یداللہ نے مارا

حضرت علی اکبر کی جنگ

تو لاشقی نے سنتے ہی یہ گرز گاؤ سر
اکبر نے دوش پاک سے لی ہاتھ میں سپر

آیا ادھر سے گرز ادھر سے چلا تبر
دو ہو گیا عمود مثال خیار تر

گر اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمن ایماں نے مل کے ہاتھ
نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ

پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ

کم تھے نہ یہ بھی زور میں گر وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑا ان کو یاد تھا

رکھ کر تبر نیام سے لی تیغ شعلہ در
تھرا کے جو اماں نے صدا دی کہ الحذر

بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
یہ بھی ادھر تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر

جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کے زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
کھولے تمام نیزہ و بیداد گر کے بند

پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند

گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر
ترکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر

تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
چلہ کٹا کماں کا زہے تیغ بے نظیر

قربان زورِ ضربتِ نصرت نشان کے
کھل کر قضا پہ بندہ گئے بازو کمان کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کماں
سیسر ادھر اٹھی تھی کہ چمکی اُدھر سناں

نیزہ اٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
بھالے کی نوک جھوک نئی تھی نئی کماں

سہما یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پر

امام علیہ السلام کی جنگ

جب رنمیں تیغ تول کے سلطانِ دیں بڑھے
مانند شیر نر کہیں ٹھیرے کہیں بڑھے

گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
گویا علی کہ اُلٹے ہوئے آستیں بڑھے

جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو
مشکلکشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا

جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جدا
سینے سے دم جدا رگِ جاں سے لہو جدا

گرجا جو رعدِ ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

آئے حسینؑ یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح

تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح

یوں تیغ تیز کوند گئی اُس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

اللہ ری تیزی و برش اُس شعلہ رنگ کی
چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی

پیاسی فقط لہو کی طلب گار جنگ کی
حاجت نہ سان کی تھی اُسے کچھ نہ سنگ کی

خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی
سو بار دم میں چرخ پہ چڑھتی اُترتی تھی

تیر افگنی کا جنگی ہر اک شہر میں تھا شور
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا اُنکو سوائے گور

تاریک شب میں جنگ کا ٹھانا نہ تھا پا دُمور
لشکر میں خوف جاں نے انہیں کر دیا تھا کور

ہوش اڑ گئے تھے فوج ضلالت نشان کے
پیکاں نہ کور کرتے تھے سو فار جان کے

صف پر صفیں پر دل پہ دل پیش و پس گرے
اسوار پر سوار فرس پہ فرس گرے

اُٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
منبر پہ پیک پیک پہ مرکب عسس گرے

ٹوٹے پہ شکست وہ فوج ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی افتاد کم ہوئی

گھوڑوں کی وہ تڑپ وہ چمک تیغ تیز کی
سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی

لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریز اگریز کی

آری جو ہو گئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے مُنہ پھیر لئے تجھے کارزار سے

میر انیس کی معجز بیانیوں کے مختلف نمونے

نیزوں کے وار

علی اکبر کی جنگ

نیزے سے ہلے وہ چل گئیں چوٹیں کہ الاماں
ہر طعن قہر کی تھی قیامت کی ہر تکاں

چنگاریاں اڑیں جو سناں سے لڑی سناں
دو اژدہے گتھے تھے نکالے ہوئی زباں

پھیلے شرر پر ندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

ان کا نہ ایک وار نہ اُس کے ہزار بند
بڑھ بڑھ کے کھول دیتا تھا یہ شہسوار بند

کیا دنیزہ بازی میں تھا بار بار بند
چوٹوں سے نیلگوں تھے جفا جو کے چار بند

خالی گئی نہ فرق کی نے دست و پا کی چوٹ
کھلتی بھی ہے بندھی ہوئی مشکلکشا کی چوٹ

ڈوبی گرہ میں نیزۂ ظالم کی جب سناں
گھوڑا اُڑا کے ہاتھ کو اکبر نے دی تکاں

اللہ رے زور اُٹھ گیا گھوڑی سے پہلواں
دستِ شفق سے چھوٹ گئی ڈانڈ ناگہاں

نیزے کے ساتھ شور اُٹھا اُس گروہ سے
لو اژدہے کو لے گیا سیمرغ کوہ سے

میدان جنگ کی چوٹیں

مصروف جنگ تیغ سے تھے سرور حجاز
چمکا کے اسپ واں سے بڑھا ایک نیزہ باز

نامرد نے کیا جو ہیں دستِ ستم دراز
نیزہ اُٹھا کے کہنے لگے شاہ سرفراز

ہاں اے اجل گرفتہ کمر استوار کر
نیزے کا بے عنر و تو آگوئی وار کر

کس طنطنہ سے شاہ پہ آیا وہ ناپسند
کل کی طرح سے پھرنے لگا ہر طرف سمند

نیزے سے اُسکے آپ کو پہنچا نہ کچھ گزند
مشکل کشا کے لعل نے کھولے تمام بند

تھا گو کہ نیزہ بازی پہ ظالم تلا ہوا
یاں تھا سب اُسکے عزم کا عقدہ کھلا ہوا

قربان زور بازوئے سلطانِ ارجمند
زیں سے اُٹھا کے اس کو سناں پر کیا بلند

پہنچا سقر میں دارِ جہاں سے وہ خود پسند
پٹکا زمیں پہ جب تو ہوا چور بند بند

اپنے ہنر پہ ناز تھا اس نیزہ باز کو
دکھلا دیا جہاں کے نشیب و فراز کو

کام اُس خطا شعار کا جب ہو گیا اخیر
نکلا پرے سے اک قدر انداز بے نظیر

بد کیش و کج نہاد و خطا پیشہ و شریر
چلے سے توڑ جاتا تھا جوشن کو جبکا تیر

کیا کوئی اُس کے آگے بھلا سر اُٹھا سکے
رستم بھی جس کماں کی نہ سیدھ اُٹھا سکے

قبضے میں تیغ لیکے پکارے شہ زماں
ہاں ناوک افگنی مجھے دکھلا تو اے جواں

ہاں نکلی منہ سے یاں کہ کھنچی اسطرف زباں
کھنچنا کماں کا تھا کہ چلا تیر بے اماں

حلقہ اُدھر کمان کا خم ہو کے رہ گیا
یاں تیغ شہ سے تیر قلم ہو کے رہ گیا

خالی اسی روش سے ہوا ترکش شریر
تودے لگائے کاٹ کی حضرت نے سارے تیر

چاہا تھا کشمکش میں کہ ہو جائے گوشہ گیر
چلائے شہ کہ بھاگ نہ اوسرکشوں کے پیر

پیچھے ہٹے نہ پانوں مرا ہے یہ جنگ کا
تو بھی تو توڑ دیکھ لے میرے خدنگ کا

یاں دوش سے کماں کو اتارا جناب نے
بیٹے کے ہاتھ چوم لئے بوتراب نے

قبضے میں ماہ نو کو کیا آفتاب نے
تاکا خطا کو تیر نگہ سے ثواب نے

ترکش بھی اژدہا سا دہن کھولنے لگا
نکلا عقاب تیر تو پر تولنے لگا

چلے میں تیر رکھ کے بڑھے قبلۂ اُمم
کچھ کہہ کے گوش شہ میں چلا تیر تیز دم

اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسر کو خم
آواز دی کماں نے زہے شاہ باکرم

چلہ تو دست شاہ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

گرز و سنان و تیغ و تبر کانپنے لگے
ڈر سے کماں کشوں کے جگر کانپنے لگے

نیزے مثال شاخ شجر کانپنے لگے
گو ترکشوں میں تیر تھے پر کانپنے لگے

پیچھے ہٹے کھڑے تھے جو ظالم بڑھے ہوئے
گوشوں سے خود اتر گئے چلے چڑھے ہوئے

دو دو چوٹیں

دو شخصوں نے اک غول سے رہوار نکالے
چار آئینہ بر میں سپریں کاندھوں پہ ڈالے

اک ہاتھ میں نیزہ لئے اک تیغ سنبھالے
امداد کو پہنچے کئی سو برچھیوں والے

کس دھوم سے وارد سر میداں ہوئے دونوں
پڑھ پڑھ کے رجز جنگ کے خواہاں ہوئے دونوں

برچھوں کو تلاتے ہوئے آئے جو وہ بدکار
ہر گشت میں پھرتے تھے فرس صورت پرکار

شبدیز کو چمکا کے پکارے شہ ابرار
آتی ہے اجل سر پہ خبردار خبردار

حافظ ہے خدا کچھ مجھے پروا نہیں جو ہو
یہ بھی ہے شگوں نیک کہ پہلے ہی سے دو ہو

ناگاہ بڑھے تول کے نیزوں کو وہ خونریز
مہمیز جو کی برق مجسم ہوئے شبدیز

ملیاپوں سے ہلا دور تلک دشت بلا خیز
فولاد میں در آئیں سنانیں تھیں وہ سرتیز

آمد میں یہ دعوے تھا ہر اک بانی شر کو
نوکوں پہ اٹھا لیتے ہیں زہرا کے پسر کو

وار آپ نے جب رد کئے انکے کئی باری
تھرانے لگے ہاتھ یہ دہشت ہوئی طاری

تھی تیغ شہ دیں غضب حضرت باری
کانپا جو کلیجہ دونی ہو گئے ناری

نیزوں کی سناں کو دم شمشیر نے کاٹا
غل تھا کہ سر شمع کو گلگیر نے کاٹا

اک ضرب میں دونوں کی جو نیزے ہوئے بیکار
تلواریں علم کر کے پھر آئے وہ ستمگار

تینیں جو چپ و راس سے چلنے لگیں اکبار
رد کے سپر حضرت حمزہ پہ وہ سب وار

دونوں کو ڈرایا بھی نہ شمشیر دوسر سے
پسپا ہوئے وہ خود تو پڑے آپ ادھر سے

اک ضرب میں ہاتھ اسکا اڑا اور سپر اسکی
دو تھا جو سر اس کا تو جدا تھی کمر اس کی

اس کو خبر اس کی تھی نہ اس کو خبر اس کی
کی موت نے دعوت ادھر اسکی ادھر اسکی

گرمی میں لڑے تھے شہ دلگیر سے دونوں
ٹھنڈے ہوئے اب دم شمشیر سے دونوں

علی اکبرؓ کی جنگ

پڑھ کر رجز دلیر در آیا سپاہ میں
گویا جھپٹ کے شیر نر آیا سپاہ میں

ہل چل ہوئی جری جدھر آیا سپاہ میں
خیبر کا معرکہ نظر آیا سپاہ میں

بجلی خدا کے قہر کی تھی یا حسام تھی
پہلے ہی وار میں صف اول تمام تھی

دوزخ میں ناریوں کی پرے پیشرو بس گئے
پانچ اُس طرف پہنچ نہ چکے تھے کہ دس گئے

آگے گئے سوار تو پیچھے فرس گئے
جب برق تیز کوندگئی سر برس گئے

چھایا تھا ابر غم سیہ بد صفات پر
غل تھا کہ اولے پڑتے ہیں کشت حیات پر

قبضہ ہر ایک تیغ سے ہر تن سے سر لیا
برچھی سے پھل تو زین فرس سے تبر لیا

ڈھالوں سے پھول لگیگئی پھولوں سے زر لیا
اپنا خراج تیغ نے اُن سب سے بھر لیا

بہر حصول جزیہ جو وہ تیغ تل گئی
اک اک گرہ بندھی ہوئی نیزے کی کھل گئی

ترکش وہ جنکو جانتے تھے سب اجل کا گھر
کاٹے ہوئے پڑے تھے وہ ریتی پہ سر بسر

ہر اک عقاب تیر کے ٹوٹے ہوئے تھے پر
طاقت نہ تھی کہ شاخ کماں تک گریں گزر

اس جنگ میں دہن کو نہ سوفار کھولے تھے
طائر ڈرے ہوئے تھے کہ منقار کھولے تھے

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف
لٹکے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف

پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف
پرکالے اڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف

خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئی شاخیں کمان کی

جی سن سنا گئے وہ جدھر سن سے آگئی
گویا سموم کوہ کے دامن سے آگئی

جلتے ہوئے کباب کی بوتن سے آگئی
چمکی تو الاماں کی صدا رن سے آگئی

کچھ واں فقط نہ فوج ہی آفت رسیدہ تھی
خوں میں زمیں بھی صورت سنبل طپیدہ تھی

ثابت نہ تھے زمیں پہ کسی تیغ زن کے ہاتھ
اڑتا تھا سر جسے یہ لگاتی تھے تن کے ہاتھ
سب تھک گئے مگر نہ تھکے صف شکن کے ہاتھ
وہ معرکہ رہا اسی گل پیرہن کے ہاتھ

پہنچا تھا ہاتھ ہاتھ جو دست خدا کا زور
ہر ضرب میں دکھا دیا خیبر کشا کا زور

سر سے عدو کے خود جدا تن سے سر جدا
شانوں سے ہاتھ ہاتھ سے تیغ و سپر جدا
سینے سے پسلیاں تو شکم سے کمر جدا
گھٹنوں سے ہر دو پائے ضلالت اثر جدا

ٹکڑے تھے عضو قطع تھا جامہ حیات کا
عالم مرکبات میں تھا مفرد ات کا

علی اکبرؑ کا مبارز

جب خوب لڑ چکا شہ دیں کا سرور جاں
نکلا ادھر سے جنگ کو اک شام کا جواں
بدکار و بدسرشت و بدآئین و بدزباں
سرہنگ و جنگجو و سلح شور و پہلواں

غرا تھا اپنے زور پہ مستانہ خراب کو
رستم کو مانتا تھا نہ افراسیاب کو

افزوں تھا دیو سے بھی تن و توش نابکار
قوت میں عمر و عنتر و مرحب کا یادگار
اسفندیار عصر و نمودار و نامدار
شیر آئے سامنے تو کرے تیسے شکار

شورش مزاج میں تو ستم آب و گل میں تھا
نا آنکھ میں حیا تھی نہ رحم اسکے دل میں تھا

بارِ گناہ حاکمِ فاسق تھا خود سر
تھی روسیاہی پسرِ سعد کی سپر

ذی جوشنِ شقی کا جو تھا نا خلف پسر
پہنے تھا اُس کے تن کی زرہ بر میں بدگہر

ظاہر کماں سے سرکشی بدنہاد تھی
قبضہ میں تیغِ بدعتِ ابنِ زیاد تھی

حضرت علی اکبرؓ اور پہلوانِ شامی کی چوٹیں

شامی بڑھا اُدھر کو جو بھالا سنبھال کے
صفدر نے دی صدا کہ ذرا دیکھ بھال کے

مہمیز کی فرس کو جو کاوے پہ ڈال کے
ہوا رِ شیر بن گیا آنکھیں نکال کے

سیماب ہو جو گرم تو پھر کیا قرار لے
نزدیک تھا شقی کو فرس سے اُتار لے

پیچھے ہٹا جھجک کے جو خونخوار کا سمند
آگے بڑھا حسینؑ کا فرزندِ ارجمند

دونوں طرف نیزوں سے ہوئے لیس ہوشمند
عقدِ ذوبر کے کھل گئے بندھنے لگے جو بند

لہراتے تھے ہوا سے پھریرے کھلے ہوئے
دو اژدہے تھے جنگ کے اوپر تلے ہوئے

گہ ڈانڈ پر تھی ڈانڈ سناں پر کبھی سناں
انیوں سے اُڑ رہے تھے شرارے کہ الاماں

ہر طعن تھی غضب کی تو افت کی ہر تکاں
طاقت کا جایزہ تھا شجاعت کا امتحاں

یہ بھی عرق میں وہ بھی پسینے میں غرق تھا
پُر زور ضرب میں حق و باطل کا فرق تھا

کرار کی بندھی ہوئی چوٹیں تھیں سب اُدھر
زخمی کبھی گلا تھا کبھی ہاتھ گاہ سر

ہشیار کر کے صید کو جھپٹا وہ شیر نر
نیزے سے کار تیغ لیا واہ رے ہنر

سر بھلا ہوئے ہیں سخی سے دنی کہیں

بوڑھی کہیں تھی ڈانڈ کہیں تھی اَنی کہیں

گرزگراں اٹھا کے بڑھا وہ سیہ دروں
آنکھیں غضب سے سرخ ہوئیں مثل جام خوں
چلتا ہے کوئی سامنے اعجاز کے فسوں
ہر ضرب میں خفیف ہوا خود وہ ذوفنوں

تھا ان کا ہاتھ فضل خدا سے علی کا ہاتھ
بے زخم کھائے ہو گیا جھوٹا شقی کا ہاتھ

ظالم نے گرز پھینک کے قبضے میں لی کماں
آیا مثال پیل قوی ہیکل و دماں
چھوڑا شقی نے تیر سہ پہلو کہ الاماں
تھا سر پہ تیغ تول کے شہزادۂ زماں

ضربت تھی یا کہ قہر خدائے قدیر تھا
گوشہ تھا نہ کماں تھی نہ چلہ نہ تیر تھا

رُخ پھیر کر چلا تھا کہ غازی نے دی صدا
او کج نہاد و سرکش و بدکیش و بے حیا
کیوں سہمگیں ہے کھینچ کے تلوار منہ پہ آ
میداں سے بھاگتا ہے یہ ہے تیسری خطا

تیغیں پکڑ کے جنگ و جدل پر تلے نہیں
ہم پر تو کچھ ابھی ترے جوہر کھلے نہیں

لی زر درو نے میان سے شمشیر برق دم
دو بجلیاں چمک کے ہوئیں یک بیک علم
لگے سیاہ ابر سپر سے اٹھے بہم
چالاکیاں دکھانے لگے اسپ خوش قدم

دونوں طرف ہوئی تگ و دو کارزار میں
یہ گرد اڑی کہ چھپ گیا گردوں غبار میں

چوٹیں ستم کی چلنے لگیں اور غضب کے وار
کس کس ہنر سے رد کیے اُس بادب کے وار
اس شان سے شقی پہ چلے تشنہ لب کے وار
یاد آ گئے ہر اک کو امیر عرب کے وار

رخ زرد تھا ہراس سے اُس ہرزہ گرد کا
یاں ٹھاٹھ تھا علیؓ ولی کی نبرد کا

شوکت وہی شکوہ وہی اور وہی جلال
تیور وہی حواس وہی اور وہی کمال
تیغ و سپر میں شیر الٰہی کی چال ڈھال
دعویٰ نہ اس پہ کچھ نہ تکبر نہ قیل و قال

نقشہ دکھا دیا شہ دلدل سوار کا
جب حرب کی تو نام لیا کردگار کا

ڈھالوں کے پرزے ہو گئے پیہم رکے جو وار
بھرتا تھا اژدہے کی طرح دم سیاہ کار
دانتوں کو پیس پیس کے آتا تھا بار بار
لیکن نہ بڑھنے دیتا تھا حضرت کا یادگار

بڑھ بڑھ کے یوں وہ ہوتا تھا پسپا دلیر سے
جس طرح زخمی صید دبکتا ہے شیر سے

لایا کلام سخت جو لب پر وہ بدزباں
بس آ گیا جلال میں شہزادۂ زماں
دستِ اجل بڑھا کہ اٹھی تیغ جانستاں
اڑ کر گیا فرس پہ سمند سبک عناں

گھبرا کے خود اجل کے شکنجے میں آ گیا
عصفور شاہباز کے پنجے میں آ گیا

نہ وہ تہمتنی تھی نہ وہ زور گیو کا
منہ پھر گیا طمانچہ ضیغم سے دیو کا
ظالم شکار بن گیا کیہاں خدیو کا
کافر وہ تھا تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا

نکلی بغل سے تیغ عجب کروفر کے ساتھ
اک ہاتھ تن کے ساتھ گرا ایک سر کے ساتھ

حضرت زینب کے بچوں کی جنگ

اُن چھوٹی سی تلواروں کے تھے کاٹ نرالے
تھیں کہنیاں پہونچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے
مثل اپنے جائے تھے جو ہمشیل رسالے
تھے جائزہ اُن سب کا یہی دیکھنے والے

نازا اپنے ہنر پہ تھا شجاعان عرب کو

موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادباں

ہلتا تھا دشت کیں دل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل
خوف خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہل نار و دغا باز و پر دغل
شکلیں مہیب دیو سے قدباروں پہ بل

بدخواہ خاندان رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے جو دو طرف سوار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسماں کے پار
آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار

گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسان شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
جانباز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف
اور دس ہزار جھپیوں والے ہیں اک طرف

سب لوگ فکر قتل شہنشاہ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سر کش کمیں میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرز گاؤ سر
ضربت سے جن کے ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہر جا بچھی ہوئی ہیں کمندیں ادھر اُدھر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پر

سب لوگ جا بجا پئے قتل ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اُپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

حالت جنگ

ناگاہ کوس حرب بجا فوج میں اُدھر
شور دہل سے آ گئے جنبش میں دشت و در

گرجا جو طبل رعد پکارا کہ الحذر
قرنا کہ غل نے کر دیا گوش سپہر کر

ڈھالوں کا ابر اٹھا کہ زمیں تیرہ ہو گئی
تیغوں کی بجلیوں سے نظر خیرہ ہو گئی

اک بار دس ہزار کمانیں ہوئیں جو زہ
تیر آئے اس طرح کہ برستا ہے جیسے مینھ

نے تھی شکن جبیں پہ نہ ابرو پہ تھی گرہ
تیروں سے غازیوں کی قبائیں ہوئیں زرہ

آنکھیں لڑی ہوئی تھیں صف فوج شام سے
تلواریں اگلی پڑتی تھیں اُن کی نیام سے

میدان رستخیز

نقارہ و غا پہ لگی چوب یک بیک
اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک

شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک
قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت و در تلک

شور دہل سے شور تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب دائی نبرد
گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری تھی گرد

تھا چرخ چار میں پہ رخ آفتاب زرد
ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد

گرمی ہجوم فوج سے وہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخ لاجورد
مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد

اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد

گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش طیر کے

شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ کانپتا تھا وادیِ نمرد
تھا دن بھی زرد دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا میں گرد

اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپوں پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں

میدانِ جنگ کی صورت

گرتی تھی برق تیغ جو ہر پل اِدھر اُدھر
سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر
شبدیز تھا کہ پھر رہی تھی کل اِدھر اُدھر
بھاگڑ تھی قلبِ فوج میں ہل چل اِدھر اُدھر

ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں گریز کے کوچے تو بند تھے

تھا الاماں کا شور پریشاں تھے اہلِ شر
تیغوں کے پیچھے ڈر کی چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علم رگڑتے تھے جھک جھک کے خاک پر
پرچم نے بال کھولے تھے فریادیوں نے سر

دانتوں میں خس ہراس سے تھے ہر جوان کے
چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے

بے رخ کمانیں تیروں سے چلے کماں سے دور
مرغانِ تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دور
برچھی سے پھل گرے ہوئے نیزے سناں سے دور
پیروں سے عقل دور تہور جواں سے دور

تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بار دوش تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں
چلکہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں تھی سناں کہیں
جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں

اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈالوں کے پھولوں سے باغ تھا

وہ گھاٹ بڑھا اور وہ اُس کی چمک دمک
کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک
ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا یا سمک

کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاؤ زمیں سٹکتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہ لعیں ہٹی
یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال نہر کہیں سے کہیں ہٹی
دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی

بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیٔ گردوں پہ چڑھ گیا

نعرہ جدا صدائے بگیر و بدہ جدا
گوشے کماں سے دور تھے گوشوں سے زہ جدا
بکتر جدا زمین پہ ٹکڑے زرہ جدا
نیزوں کو دیکھیے تو گرہ سے گرہ جدا

اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تنوں میں دم نہ تھے

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس
بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضہ کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس
کڑیاں زرہ کی پاس نہ دامن سپر کے پاس

نیزے نہ تھے سناں پہ نہ پرچم نشان پر
پیکاں نہ تیر پر تھا نہ چلہ کمان پر

اشعار تعریف سراپا

سراپائے علی اکبرؓ

پیدا ہے زلف و روئے منور سے شانِ رب
نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب

یہ لطف عید اور شبِ قدر میں ہے کب
ہے دو طرف تو جبین و خطا بیچ میں حلب

رشتہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

پہلو میں دن کے رات زہے شانِ کارساز
یوسف جو دیکھ لے تو جھکائے سر نیاز

افزوں ہے سب سے رونقِ دینِ شہ حجاز
زیبا ہیں گورے رخ پہ غضب گیسوئے دراز

اب تو نظر پہ یہ شبِ معراج چڑھ گئی
حیرت ہے دن تو کم نہ ہوا رات بڑھ گئی

کیوں زلف کی ثنا میں الجھتے ہیں موشگاف
سلجھا ہوا بیاں ہو تو مضموں ہے صاف صاف

تقلید سر بسر ہے فصاحت کے برخلاف
باریک اس فتن کی ہیں راہیں خطا معاف

فکر رسا ہے جنکی یہاں وہ بھی ہیچ ہے
رستہ تو بال بھر کا ہے اور لاکھ پیچ ہے

وہ خود فرقِ پاک پہ وہ چاندسی جبیں
پرتو سے جس کے غیرتِ مہتاب سب زمیں

قرآں کی لوح مطلعِ نور آفتاب دیں
آئینہ حلب ید بیضا مہ جبیں

اس کو جو اُس جبیں کے برابر نہ دیکھتا
پھر اپنے آئینے کو سکندر نہ دیکھتا

ابرو ہے یا کھچی ہوئی شمشیر تیز دم
صانع نے ایک لوح پہ رکھے ہیں دو قلم

یا بھلا کمان کیانی نے کب خیم
کیا متصل ہو گوشہ سے گوشہ زہے چشم

مدت کھنچے تو پھر کشش ان کی بیان ہو
قربان ہو لاکھ بار تو خاطر نشان ہو

خمدار وہ بھویں وہ جبین قہ مثال
تابندہ ایک چاند کے نیچے ہیں دو ہلال

مطلع ہے صاف غور سے بینا کریں خیال
نقطہ ہے نور حسن کا ابرو پہ جو ہے خال

خوبی میں یہ تو یہ ہمہ تن لاجواب ہے
دیوان حسن میں یہی بیت انتخاب ہے

ہے آسمان حسن و شرف یہ فلک جناب
ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب

منظور شمسی و قمری کا ہو گر حساب
ہاں دیکھ لیں رخ خلف ابن بوتراب

باریک ہیں سمجھ گئے مطلب انیس کا
انتیس کا وہ چاند ہے یہ چاند تیس کا

مانند شانہ گر ہمہ تن ہو کوئی زباں
تو بھی مژہ کا وصف سرمو نہ ہو بیاں

قربان حسن صنعت خلاق انس و جاں
پردا ہے بہر چشم کبھی گاہ سائباں

موئے نگین در ثمین نجف یہ ہے
آنکھوں پہ جس کو رکھتے ہیں مردم شرف یہ ہے

اس چشم کو وہی کہے نرگس جو ہے بصیر
پیش نظر یہ دیدۂ حق بیں ہے بے نظیر

کیوں ہرزہ گرد ہو کی نگاہوں میں ہوں حقیر
یہ عین مردمی ہے کہ مردم ہیں گوشہ گیر

اس نور کے مکاں سے نکلنا فضول ہے
گھر بیٹھے ان کو سیر دو عالم حصول ہے

بیمار کہتے ہیں شعرا چشم کو جو سب
صحت میں اسکی شک ہے غلط ہو تو کیا عجب

دارالشفا یہ خود ہے پیئے بندگانِ رب
دیدان کی ہر مریض کی صحت کا ہے سبب

چشمک ہے ان کو عیسیٰ گردوں پناہ سے
مردے جلا دیئے ہیں کرم کی نگاہ سے

آنکھیں وہ نرگسی جنہیں دیکھے سے ہو سرور
روشن میان کعبہ ہیں یہ دو چراغ طور
یا صاف دو ستاروں کا ہے ایک جا ظہور
کوثر سے یا بھری ہوئے ہیں ساغر بلور

حق بیں ہیں حق شناس ہیں یزداں پرست ہیں
ہشیار کیوں نہوں مئے عرفاں سے مست ہیں

جاگے ہیں رات کو تو نقاہت ہے آشکار
ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
مستانہ ہے یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار
آنسو ہیں یا صدف میں ہیں یہ در شاہوار

روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

رخسار کو قمر جو کہوں اس میں داغ ہے
خورشید ہے تو کیا ہے وہ دن کا چراغ ہے
ذروں کو سر چڑھائے یہ کس کا دماغ ہے
وہ گل ہیں جنکے ذکر سے دل باغ باغ ہے

دنیا میں کوئی شے نہیں سرآب و تاب کی
رنگت ہے سیوتی کی تو خوشبو گلاب کی

آیا لبوں کا ذکر بس اب ناطقہ ہے بند
ہے بے نمک یہ بات کہوں گر نبات و قند
کیا لطف گر مرا نہ اٹھائیں سخن پسند
خود ہر سخن سے انکی فصاحت ہے بہرہ مند

اعجاز ہے زبان بلاغت نظام میں
قرآں کی ساری شان ہے اُن کے کلام میں

مشکل ہے وصفِ گوہرِ دندانِ بے مثال
غواص بحرِ حسن دکھا آج کچھ کمال
اس مدح میں صلہ کہ جو بننے کا ہے خیال
بھر دیجیو موتیوں سے دہن فاطمہؑ کا لال

قبضے میں آسماں کے خزانے زمیں کے گنج
ہنس ہنس کے یہ لٹاتے ہیں در ثمیں کے گنج

اعجاز دونوں ہاتھوں میں مشکلکشا کا ہے
زوران کلائیوں میں شہ لافتا کا ہے

گھر بازوں میں قوتِ خیبر الوا کا ہے
سینہ نہ جانیو یہ خزانہ خدا کا ہے

کیوں شور ہو نہ انکے قدم کے ثبات کا
جس سے تھما ہوا ہے سفینہ نجات کا

پڑتا ہے ماہ رُخ کا جو پرتو ادھر اُدھر
پھرتی ہے چاندنی کی طرح ضو ادھر اُدھر

گرتے ہیں کانپ کانپ کے سو سو ادھر اُدھر
لشکر میں بے وغا ہے روا رو ادھر اُدھر

دیکھو تو منصفو یہ ملک ہے بشر نہیں
چہرے پہ ضو یہ ہے کہ مجالِ نظر نہیں

علی اکبر کا سراپا

گیسوئے مسلسل رُخ روشن پہ جو ہیں تار
ہے ان سے عیاں سلسلۂ احمد مختار

یہ مصحفِ رخسار کی سطریں ہیں نمودار
ہیں معنی پیچیدہ کھلے گر تو ہو طومار

زلفوں میں کرو غور ذرا رُخ کی ضیا کو
دیکھو شبِ معراج میں محبوب خدا کو

چہرے کو اگر صبح کہیں زلف کو گر رات
دن ہوتا ہے جب خلق سے کرتی ہے سفر رات

دنیا میں سدا شام سے ہوتا بہ سحر رات
یاں بیچ میں خورشید ادھر رات اُدھر رات

گیسوئے رسا روئے دل افروز بہم ہیں
کیا قدرتِ حق ہے کہ شب و روز بہم ہیں

ابرو جو کمانیں ہیں تو مژگانِ سیہ تیر
ہے جنکے ہر اک گوشہ پہ قرباں دلِ شبیرؑ

ہے دیدہ و ابرو سے عیاں جنگ کی تصویر — دو مردم خونریز ہیں کھینچے ہوئے شمشیر

اب دیکھیں تو کون آنکھ ملا سکتا ہے رن میں
الٹیں گی صفیں فوج کی اک چشم زدن میں

پستہ ہے کہ غنچہ ہے دہن عقل ہے یا گم — لالے کی کلی میں نہیں دیکھا یہ تبسم
دانتوں کی چمک دیکھ کے ہنگام تکلم — اشکوں کی طرح آنکھ سے گرجاتے ہیں انجم

تابش میں جو دندان شکن برق ہوئے ہیں
دریائے خجالت میں گہر غرق ہوئے ہیں

ہمشیل ہے یہ گردن و بازو و بر و دوش — ساعد کی ضیا دیکھ کے موسیٰ کا اڑے ہوش
ہے ضو سے ہتیلی کی قمر ابر میں روپوش — یہ انگلیاں روشن ہیں کہ شمعیں ہوئیں خاموش

ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا
شرما کے مہ نو نے جھکایا ہے سر اپنا

سینہ ہو وہ سینہ کہ جو کینے سے بری ہے — نور اس میں ہے یا آئینہ میں عکس پری ہے
کب قرص مہ و مہر میں یہ جلوہ گری ہے — یاں روشنیٔ طور چراغ سحری ہے

دیکھے جو اسے علم کے گنجینے کو دیکھے
اس سینے کو جو دیکھے تو آئینے کو دیکھے

بے مثل ہے سینے کی طرح یہ شکم صاف — ہے صاف تو یہ بات کہ دشوار ہیں اوصاف
دیکھیں جو نظر بھر کے اسے صاحب انصاف — خورشید سے روشن ہو تو آئینہ سے شفاف

ضو ایسی نہ آئینہ مہتاب میں دیکھی
محفل نے یہ نرمی نہ کبھی خواب میں دیکھی

ہیں انکے قدم راہ رو جادۂ تسلیم — ہاتھ آئے ہیں کیا پاؤں نہ ہو عزت و تکریم
ان قدموں پہ جو سر ہو وہ ہے لایق تعظیم — ثابت قدمی ان سے سدا پاتی ہے تعلیم

روشن جو زمیں سے ہے تو یہ پرتو ہے انہیں کا
جو راہ خدا میں ہے وہ پیرو ہے انہیں کا

بند سراپائے علی اکبرؑ

آنکھوں کو عین کعبہ سمجھتے ہیں حق پرست
کیفیت رحیق محبت سے ہیں یہ مست

صانع نے کر دیا صفِ مژگاں کا بند و بست
عین الکمال سے انہیں پہنچے نہ تا شکست

مردم میں روشنی ہے اسی نورِ عین سے
دیکھے کوئی ان آنکھوں کو چشمِ حسینؑ سے

گلزارِ حسن سے کوئی دیکھے دہن کا رنگ
اڑتا ہے غنچہ و سمن و یاسمن کا رنگ

شرمندہ ہو لبوں سے عقیقِ یمن کا رنگ
رنگیں بیاں ہیں سب سے جدا ہو سخن کا رنگ

بلبل بھی مدح خواں چمن مرتضیٰ کی ہے
غنچے سے پھول جھڑتے ہیں قدرت خدا کی ہے

روشن ہو دشت گردن نازک کے نور سے
فی الواقعی فزوں ہے ضیا شمع طور سے

موسیٰ دکھاتے ہیں یدِ بیضا کو دور سے
شیشہ بھرا ہوا ہے شرابِ طہور سے

گردن بھی بے عدیل گلابی مثال ہے
تکمہ سہیل ہے تو گریباں ہلال ہے

سینہ خزینہ کرم و عدل و داد ہے
ہاں لاکلام مصحفِ دب عباد ہے

جو طب یا بس اسمیں ہو سب انکو یاد ہے
ایمان جانتا ہے جو خوش اعتقاد ہے

دولت جو نوح کی ہو سفینے میں ان کے ہے
جو طور پر ضیا تھی وہ سینے میں ان کے ہے

کس طرح کوئی وصف سراپا کرے رقم
جلوہ خدا کے نور کا ہے سر سے تا قدم

قطرہ کہاں کہاں صفتِ قلزمِ کرم
چونٹی سے کیا ہو مدح سلیمان ذی حشم

یاں سب تعلیاں شعرا کی فضول ہیں
بس خاتمہ ہوا کہ شبیہ رسول ہیں

حضرت عباسؓ کا سراپا

جلتے رہیں کیوں کر نہ مہ و خور سحر و شام
ہے حسن کی آتش سے بھبھوکا رخ گلفام

خال اور خط سبز وہ دانہ ہے تو یہ دام
ہے سب دل عالم کی اسیری کا سرانجام

بینی کو جو دیکھو تو عجب شوکت و شاں ہے
یہ حسن علمدار کے لشکر کا نشاں ہے

اک جا تو مناسب نہ تھے دو مردم بیمار
صانع نے اٹھا دی ہو فقط نور کی دیوار

اک شاخ سے یا دو گل بادام ہیں اظہار
یا یہ الف ماہ دو ہفتہ سے ہے نمودار

خوشبوئے گلستان ارم اس میں بھری ہے
گویا ورق زر پہ کلی گل کی دھری ہے

یاقوت لب سرخ ہیں دنداں در مکنوں ہیں
دیکھے سے عقیق یمنی کا بھی ہو دل خوں

کس چیز سے نسبت دہن تنگ کی میں دوں
نایاب ہے عنقا کی طرح طارِ مضموں

حال انکا نزاکت سے کھلے گا نہ کھلا ہے
یاں باب سخن بند ہی رکھیں تو بجا ہے

آتی ہے صدائے در و دنداں جو زباں پر
تقریر کے رشتہ میں پروتا ہوں میں گوہر

ہیرے کی نگیں ان سے ہوں کس طرح برابر
یہ بحر شرافت کے ہیں موتی تو وہ پتھر

ہنسنے میں جو پڑ جاتا ہے عکس ان کا فلک پر
بجلی بھی تڑپ جاتی ہے دانتوں کی چمک پر

سراپائے قاسم کے بند

حیران تھا لشکر یہ ملک ہے کہ بشر ہے
گیسو ہے کہ ہالہ ہے جبیں ہے کہ قمر ہے
یہ ابروؤں کی بیت ہے یا حسن کا گھر ہے
پلکیں ہیں کہ سرپنجۂ شہباز نظر ہے

یاں دیدہ آہو بھی نگاہوں سے گرے ہیں
آنکھیں ہیں کہ دو شیر نیستاں میں کھڑے ہیں

فانوس میں ہے شمع کہ ہر رخت بدن میں
رخساروں پہ گیسو ہیں کہ ہے چاند گہن میں
ہر شخص کی آنکھوں کو چکا چوند ہے رن میں
سہرہ میں یہ چہرہ ہے کہ سورج ہے کرن میں

تڑپے گا وہ تربت میں جگر بند ہے جسکا
کیا گزرے گی اُس ماں پہ یہ فرزند ہے جسکا

غنچوں نے کہاں پائی لب ایسے دہن ایسا
باتوں میں مزا قند کا شیریں سخن ایسا
ہے عکس سے ملبوس گلابی بدن ایسا
گل تھا کہیں دیکھا نہیں گل پیرہن ایسا

انداز سراپا سے عجب لطف ملا ہے
جنت کا چمن سامنے آنکھوں کے کھلا ہے

آنکھیں وہ غزالان ختن جن پہ تصدق
رخسار وہ نازک کہ چمن جن پہ تصدق
لب ایسے کہ سو لعل یمن جن پہ تصدق
دانت ایسے کہ در ہائے عدن جن پہ تصدق

دانتوں سے لڑا لے کوئی موتی کی لڑی کو
ہو جائیں گریاقوت کے نگ کوئی گھڑی کو

ہر چند کہ ملبوس میں مستور ہے سینہ
روشن صفتِ روشنیٔ طور ہے سینہ
ظاہر ہے کہ اک آئینہ نور ہے سینہ
اللہ کے اسرار سے معمور ہے سینہ

نہ بدر میں یہ نور نہ یہ مہر میں ضو ہے

تکمہ تو ستارہ ہے گریباں مہ نو ہے

نعت سرور کائنات

فخرِ ملک و اشرفِ آدم ہے محمدؐ
اکلیلِ سرِ عرشِ معظم ہے محمدؐ

حقا کہ خداوند دو عالم ہے محمدؐ
آخر ہے مگر سب سے مقدم ہے محمدؐ

ایسا کوئی محرم نہیں اسرار احد کا
حال اُس سے ہے پوشیدہ ازل کا نہ ابد کا

اللہ نے دی تھی اُسے کونین کی شاہی
امی تھے پہ دل میں تھا بھرا راز الٰہی

دی سنگ نے اُس شہ کی رسالت پہ گواہی
اشجار بھی اعجاز سے اُس کے ہوئے راہی

دی مردوں کو جاں سبز کیا خشک شجر کو
دو کر دیا اونگلی کو اشارے سے قمر کو

بے سایہ جو مشہور وہ سلطان عرب ہے
پیش عقلا وجہ یہ ہے اور یہ سبب ہے

ہے کون عدیل اُس کا کہ وہ سایہ رب ہے
دنیا میں کسی سایہ کا سایہ کہو کب ہے

ہے دوسری یہ وجہ کہ وہ جان جہاں تھا
بے سایہ کہ تھا جاں کی طرح سایہ کہاں تھا

پہلے کیا اللہ نے جس چیز کو پیدا
لکھا ہے کہ وہ نور جناب نبوی تھا

دس سو برس اُس دن سے وہ نورِ شہ والا
استادہ رہا روبروئے خالق یکتا

گہہ حمد و ثنا گہہ صفتِ قدرت حق تھی
اس نور پہ ہر دم نظرِ رحمتِ حق تھی

اُس نور سے فرماتا تھا یہ حضرتِ معبود
ہے خلق سے تو میری مراد اور مرا مقصود

عزت کی قسم اپنی جو تو ہوتا نہ موجود
تو رہتی بنا عالم ایجاد کی نابود

پیدا کبھی کرتا نہ زمیں کو نہ فلک کو
دوزخ کو نہ جنت کو نہ آدم نہ ملک کو

اک بار یہ سُنکر سخنِ خالقِ اکرم
سجدے کے لئے جھک گیا وہ نورِ مجسم
اونچا کیا سجدے سے سر پاک کو جس دم
پیشانی سے تب نور کے قطرے گرے پیہم

اُس نور کے قطروں سے پیمبر ہوئے پیدا
دریائے نبوت سے یہ گوہر ہوئے پیدا

تب کرسی و لوح و قلم و عرش و معلا
نجم و مہ و مہر و ملک و گنبدِ خضرا
شام و سحر و ظلمت و ضو جنت و دنیا
اللہ نے سب نورِ نبی سے کئے پیدا

حق یہ ہے کہ باعث ہے وہ عالم کی بنا کا
کیا رتبہ ہے کیا فیض ہے محبوبِ خدا کا

گرمی کا سفر

وہ کوس کڑے اور پہاڑوں کی وہ راہیں
یہ دھوپ میں شدت تھی کہ جلتی تھی زمیں
دشوار تھا پانی کسی چشمے سے جو پائیں
اٹھتا تھا دھواں لُو سے نکل جاتی تھیں آہیں

سونلا گئے تھے چاند سے مُنہ سیم بروں کے
ثابت تھا کہ خورشید برابر ہے سروں کے

مخفی تھے شرر شدتِ گرما سے حجر میں
چلتی تھی یہ لو آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نہ بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ گھر میں
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں

پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنوئیں خشک پڑے تھے

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے
ناری تھی ہوا سبز شجر زرد تھے سارے

ڈوبے تھے عرق میں اسد اللہ کے پیارے
دھڑکا تھا کہ یوں کسی بچے کو نہ مارے

اللہ ری تب و تاب بیابان بلا کی
پھولوں کا عرق کھینچتا تھا گرمی سے ہوا کی

آفتاب کا نکلنا

پھاڑا جو گریباں شب آفت کی سحر نے
پردے میں چھپایا رخ روشن کو قمر نے

پیمانہ خورشید لگا نور سے بھرنے
گردوں سے سفر فوج کواکب لگی کرنے

تاباں جو رخِ منیرِ افلاک ہوا تھا
ذروں سے زر افشاں ورق خاک ہوا تھا

اظہار ہوئی خط شعاعی کی جو تنویر
روئے شب یلدا سے سیاہی ہوئی تغیر

خورشید نے کی سورۂ والشمس کی تفسیر
والفجر کی کرتا تھا تلاوت فلک پیر

پھیلا ہوا تھا نور سحر ارض و سما میں
مصروف تھی سب خلق خدا یاد خدا میں

تمازتِ آفتاب

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لوں کا وہ چلنا
وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا

ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا
اور تن پہ حرارت سے وہ ہتیار دنکا جلنا

جنگل کے چرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہ مظلوم کھڑے ہیں

وہ دھوپ کہ جس میں ہرن ہوتے ہیں کالے
اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے

گرمی سے دد و دام ہیں منہ آب میں ڈالے
ریتی پہ دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے

آہن کی بھی شے موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چٹکتے یہ زمیں گرم ہوئی ہے

عالم غربت

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے
چھٹتا نہیں گر جان نکل جاتی ہے تن سے

آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح عجب شام
کرتا ہے سفر قافلۂ راحت و آرام
وہ دشت نوردی وہ غم و صدمہ و آلام
منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سر انجام

امید آتی ہے کب لاکھ جو پٹکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

میدان جنگ کی گرمی

گھوڑوں سے گونجتا ہے وہ سب وادیٔ نبرد
گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری ہے گرد
ہے چرخ چارمیں پہ رخ آفتاب زرد
ڈر ہے گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد

گرمی ہجوم فوج سے وہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

دستے وہ مصر و زنگ کے وہ فوج روم و شام
دن دو پہر وہ دشت کی گرمی وہ ازدحام
تیغیں برہنہ ہو گئیں تھیں چھوڑ کر نیام
مانند شمع جل رہی تھیں برچھیاں تمام

تلواریں منہ چھپائے تھیں سایہ میں ڈھال کے

خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے

لوں چل رہی تھی رن میں کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کے رنگ ہو گئے تھے دھوپ میں سیاہ
برچھی کے پھل پہ ہوتا تھا شعلے کا اشتباہ
گلخن بنی ہوئی تھی ہر اک آہنی کلاہ

گویا کہ قوس میں تھا گزر آفتاب کا
عالم تھا ہر خدنگ پہ تیر شہاب کا

گرمی کی شدت

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

سُرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
سایہ کنوئیں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

آب رواں سے مُنہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خسخانہ مریٰہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینہ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافور صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر میں
بادل چھپے تھے کرۂ زمہریر میں

شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے
آہو نہ مُنہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پہ تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

مسافرت

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں
سنگ غم فرقت دل نازک پہ گراں ہے
اندوہ غریب الوطنی کاہش جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد
جاتی نہیں افسردگی خاطر ناشاد
جب عالم تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل مثل جرس کرتا ہے فریاد
اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر
منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر
جب ہو سفر خوف و پریشانی خاطر
شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر
ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے
رہ جائے پس قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دکھ دیتے ہیں اک اک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے

ہاتھوں سے اگر بیٹھے کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

دامندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی جو بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

رفقائے حسینی

وہ چاند سے ماتھے وہ قبائیں وہ عبائیں
تن پھول سے غنچوں کی طرح تنگ قبائیں

تسبیحیں تو ہاتھوں میں زبانوں پہ دعائیں
بس جائے وہ سب راہ پہ جس راہ سے جائیں

نورمہ کامل کبھی سینے کو نہ پہونچے
بو ایسی کہ عطر اُن کے پسینے کو نہ پہونچے

کس شان سے شملوں کے سرے دوش پہ چھوڑے
یتغیں بھی جو برسیں تو کبھی مُنہ کو نہ موڑے

وہ رعب وہ اقبال وہ ہتیار وہ گھوڑے
ایک ایک جری شیر کے پنجے کو مروڑے

برباد کریں کوہ کو ہاموں کو اُلٹ دیں ؛
خیبر کی طرح قلعہ گردوں کو اُلٹ دیں ؛

جاتے تھے سواری میں جلال و حشم آگے
جلدی تھی ہر اک کو کہ نکل جائیں ہم آگے

غل تھا کہ بڑھے جاؤ قدم باقدم آگے
پیچھے تو محمدؐ کا نشاں تھا علم آگے

جنت کے پھریرے سے ہوا آتی تھی رن میں
طوبا نے جگہہ پائی تھی زہرا کے چمن میں

سفر کی تیاری

حاضر در دولت پہ ہیں سب یار و انصار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار

کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتیار
چلاتے ہیں درباں کوئی آئے نہ خبردار

ہر محل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لئے فراش کھڑے ہیں

صبح کی سینری

طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشان صبح

گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح

پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھایا نقاب شب
در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب

انجم کی فرد فرد سے لے کر حساب شب
دفتر کشائے صبح نے الٹی نقاب شب

گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطان غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

پہنچا جو مہر مہر سے فرمان عزل شب
گردوں پہ عاملان سحر کا ہوا نصب

منشی آسماں مع دفتر ہوا طلب
بس جا بجا سے اٹھ گئی انجم کی فوج سب

تا صبح فرد فرد میں بیگانگی ہوئی
برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی

یوں گلشن فلک سے ستارے ہوئے رواں
چن لی چمن سے پھولونکو جس طرح باغباں

آئی بہار پر گل مہتاب کی خزاں
مرجھا کے گر گئے ثمر و شاخ کہکشاں

دکھلائے طور باد سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یاد خدا میں زمزمہ پردازئ طیور

وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور

انسان زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخی شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
وہ بار ور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشت کربلا کی زمیں رشکِ آسماں
تھا دور دور تک شبِ مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذرہ پہ تھا گماں
نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں

سرسبز جو درخت تھا وہ گل بطور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

دشت کربلا کی صبح

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا
مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا
وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا

اُس دشت میں رونق تھی جو شبنم شہ دیں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

جلوہ وہ دم صبح کا وہ نور کا عالم
دلچسپ صدا نوبت دشنا کی وہ باہم
سرخی وہ شفق کی اُفقِ چرخ پہ کم کم
وہ گل کے کٹوروں پہ دُر افشانی شبنم

خشکی میں بھی سردی سے تراوٹ کا سماں تھا
پر مالکِ گلزارِ جناں تشنہ دہاں تھا

خوفناک جنگل

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں کہیں مائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں

گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

اندھیری رات

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اُس شب کی سیاہی
ہے چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغانِ ہوا بر میں طپاں بحر میں ماہی
تربت سے نکل آئے تھے محبوبِ الٰہی

کہتے تھے ملک رات نہ ہوگی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی نہ تھی تاریک شب ایسی

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہ والا
آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اُجالا
خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا

خاک اڑتی تھی منہ پر حرم شیرِ خدا کے
تھا چیں بہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

جاسوس کا خبر دینا

پہنچے نہ تھے امام ابھی تا بہ قتل گاہ
جاسوس نے یہ آکے خبر دی میانِ راہ
قایم رہے شکوہِ شہنشاہِ دیں پناہ
آمادۂ نبرد ہے سب شام کی سپاہ

ناوک فگن کہیں ہیں کہیں نیزہ دار ہیں

میداں سے تا بہ نہر ہزاروں سوار ہیں

ذروں کی طرح فوج کا ممکن نہیں شمار
اُس گھاٹ پر فقط ہیں کماندار دس ہزار

اُنسے اُدھر کو چھپیوں والوں کی ہے قطار
نیزے ہلا رہے ہیں سواران ہرزہ کار

پانی سیاہ شام سے پانا محال ہے
دریا تلک نگاہ کا جانا محال ہے

امام علیہ السلام کا خیمہ

وہ سر بلند خیمۂ زنگاریٔ امام
جس میں خدا کے عرش کے تارونکا تھا مقام

کم تھا نہ اُس کا خانۂ کعبہ سے احترام
قدسی طواف کرنکو آتے تھے صبح و شام

جلوہ تھا اُس میں برج امامت کے ماہ کا
درباں تھا جبرئیلؑ اُسی بارگاہ کا

گنبد تھے حور خلد کے ہمسر ہر اک طناب
دریا تھا وہ تو گنبد گردوں تھا اک حباب

وہ شان وہ شکوہ وہ رفعت وہ آب و تاب
شمسی سے جسکے آنکھ چراتا تھا آفتاب

پڑھنا درود آکے ملایک کا ورد تھا
سائے کے بدلے نور قناتوں کے گرد تھا

وہ اوج اور وہ قبہ پر نور کی جھلک
ضو نور کی زمین سے تھی آسماں تلک

دب دب کے سر جھکاتا تھا جھک کر بہ فلک
اٹھ اٹھ کے دیکھتے تھے اُسے عرش سے ملک

خوشبو سے ہر بشر کا معطر دماغ تھا
وسعت سے اُس کی صحن کا دل باغ باغ تھا

تھا وہ بہر دیں تو ہر اک چوب رکن دیں
چکر میں اسکے دور سے تھا چرخ ہفتمیں

تھا در پہ اُسکے گلشن فردوس کا یقیں
پردے تھے رشک پردۂ چشمان حور عیں

جلوہ سے حسن روئے شہ کائنات کے
آئینہ ہائے نور تھے ثقبے قنات کے

امام حسینؑ کی نماز جماعت

آراستہ صفیں تھیں کہ قرآں کھلا ہوا
بسم اللہ جیسے آگے ہویوں تھا وہ مقتدی
اور مقتدی تھے سب عقب شاہ کربلا
مصحف کی جس طرح سے ہوں سطریں جدا جدا

جیسا امام ویسی ہی ابرار فوج تھی
ہر صف خدا کے نور کی دریا کی موج تھی

جوانان حسینی

اک اک دلیر شیر نیستان کارزار
رستم کی روح خوف سے جنکے کرے فرار
دیندار سرفروش نمودار نامدار
رانوں میں کوندے ہو بجلی سے راہوار

للکار لیں جو فوج کو نیزے سنبھال کے
بھاگیں عدو زمین پہ ہتیار ڈال کے

اولاد کا ہونا

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاج دل مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی روح یہی روح یہی ہے

۱؎ ثقبہ بمعنی سوراخ ۱۲

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے
گل ہو کہ گہر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہو اسی سے
آبادیٔ کاشانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ ہو وہ عصا پیرِ جواں رہتا ہے جس سے
یہ ہو وہ نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نور مکاں رہتا ہو جس سے
وہ دُر ہو قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

دولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے
ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے
گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہو پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہو پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہو پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرام جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہو کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہو خوشی در پہ کھڑی رہتی ہو جس سے
وہ چین ہو راحت کی گھڑی رہتی ہو جس سے
وہ لال ہے امید بڑی رہتی ہے جس سے
وہ دُر ہو یہ در جان لڑی رہتی ہے جس سے

آرام و جگر تاب و تواں ساتھ ہے اسکے
پھرتا ہے جدھر رشتۂ جاں ساتھ ہو اسکے

عنایات ایزدی

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب
دے کسی شخص کو بندے میں یہ مقدور ہے کب
اس مسبب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب
وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب

اپنے کیسے سے نہ دام اور نہ درم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

لاکھ ہاتھ اُسکے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد
ہم اُسے بھولیں تو بھولیں اُسے ہر وقت ہے یاد
رزق وہ حوصلہ حرص سے دیتا ہے زیاد
شکر معبود کا اس پر بھی نہیں کرتے عباد

وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اُس کا
کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اُس کا

جس قدر اُس سے طلب کیجئے خوشنود ہے وہ
صاحب جود ہے وہاب ہے محمود ہے وہ
ہاتھ پھیلائے سو بار تو موجود ہے وہ
بخش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے وہ

پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے
یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

امام حسینؑ فرماتے ہیں

اب عمر بھی آخر ہے نمازیں بھی ہیں آخر
بے توشہ پہنچتا نہیں منزل پہ مسافر
ہر وقت ہے رب دو جہاں حاضر و ناظر
اجراُن کا مضاعف ہے جو ہیں صابر و شاکر

مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو
بندہ وہی بندہ ہے جو بھولے نہ خدا کو

نام اُس کا ہے ورد سفر ہو کہ حضر ہو
موجود سمجھ لے اُسے جنگل ہو کہ گھر ہو

سجدے ہی کروں دکھ میں کہ راحت میں بسر ہو
تسبیح میں شب ہو تو نمازوں میں سحر ہو

عشق گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے
معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے

چومے لب سوفار جو سینے پہ لگیں تیر
دم عشق کا بھرتا رہے زیر دم شمشیر

زخموں کو یہ سمجھے کہ ملا گلشن توقیر
تکبیر کا نعرہ ہو زباں پر دم تکبیر

کٹنے میں رگوں کے صدا آہ کی نکلے
ہر رنگ میں بوالفتِ اللہ کی نکلے

امام حسینؑ گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں

یہ کہہ کے بڑھے سرور دیں جانب توسن
ہتیار لگائے ہوئے پہنے ہوئے جوشن

اسوار ہوئے آپ جو گردان کے دامن
الدری ضیا خانہ زیں ہو گیا روشن

وہ پایوں رکابوں کے لئے باعثِ ضو تھی
خورشید کے قدموں کے تلے دو مہ نو تھے

امام حسینؑ کی سواری

میداں میں جب سواریٔ شاہِ امم چلی
کس شان سے جلو میں سپاہ حشم چلی

فتح و ظفر ادب سے قدم باقدم چلی
بدلی ہوا سیم ریاض ارم چلی

سر تاج عرش تھا جو مکیں صدر زین پر
قدسی پروں کو فرش کئے تھے زمین پر

جوں جوں قدم بڑھاتا تھا سرور کا خوشخرام
بنتے تھے نقش سم سے زمیں پر مہ تمام

تھا ارض کربلائے معلےٰ کا یہ کلام
گو فرش تھی یہ اب میں ہوئی عرش احتشام

ذروں کا اُس زمیں کے فلک پر دماغ تھا
ہر سنگ ریزہ رشکِ دہِ دشت و زاغ تھا

بچھی تھی ایک نور کی چادر جو دور دور
ہنستا تھا کہکشاں پہ یہ جادہ کو تھا غرور
ہنستے تھے روئے مہر پہ ذرے نہیں تھا یہ نور
ہر سنگریزہ کہتا تھا میں ہوں چراغ طور

تھا یہ زمیں کا قول کہ عنبر سرشت ہوں
کہتی تھی گرد نکہتِ باغ بہشت ہوں

وہ صبح اور وہ جلوۂ خورشید خاوری
وہ صاف صاف آئینہ چرخ اخضری
وہ نور اور وہ شانِ جوانانِ حیدری
راکب ہر اک ملک تھا تو مرکب ہر اک پری

صد قے سواری شہ گردوں رکاب کے
گویا ستارے جاتے تھے ساتھ آفتاب کے

موت

شکر خدا کہ موت ذری مہلت اس برس
اک دم میں ٹوٹ جاتا ہے یہ رشتۂ نفس
جو ذی حیات ہے اُسی جینے کی ہے ہوس
لیکن قضا سے کچھ نہیں چلتا کسی کا بس

چپکے چلے گئے ہیں زباں تک ہلی نہیں
ہم کیا پیمبروں کو تو مہلت ملی نہیں

فانی ہیں سب کسی کو نہ دیگی اجل اماں
اُسدم کھلے گا جسم سے نکلے گی جبکہ جاں
چکھے گی آہ ذائقہ موت ہر زباں
تھا گنج شائگاں کہ ہوا مفت رائگاں

لازم ہے قدر عمر کہ جنس خطیر ہے
جس کی بہا نہیں وہ دُرِ بے نظیر ہے

پھر کر نہ آئے گا وہ گزرتا ہے جو کہ دم
اس دم کی احتیاط مناسب ہے دمبدم

کہتا ہے دم قریب ہے اب منزل عدم
بڑھتا ہے سن مگر ہوئی جاتی ہے عمر کم

انجام کار قبر کی منزل نظر میں ہے
ہم ہیں وطن میں عمر ہماری سفر میں ہے

جو شے کہ مستعار ہو کیا اُس کا اعتبار
ہر گل پہ یاں خزاں ہے کبھی اور کبھی بہار

ہے عمر بے وفا تو زمانہ ہے بے مدار
آنکھوں کے آگے اُٹھ گئے کیا کیا رفیق و یار

افسوس اس چمن میں وہ سرو رواں نہیں
ڈھونڈیں اُنہیں کہاں کہ قدم کا نشاں نہیں

حالت زمانہ

جو زندہ ہو قدر اسکی کسی کو نہیں زنہار
زندوں سے کچھ ان مردہ پسندوں کو نہیں کار

عبرت کی ہے جا فاعتبروا یا اولی الابصار
سو جاتا ہے جب وہ تو یہ سب ہوتے ہیں بیدار

روئے تو اُسے کیا جو ثنا کی تو اُسے کیا
تعریف اگر بعد فنا کی تو اُسے کیا

گر زیست میں فاقہ ہو تو غم کوئی نہ کھائے
اور وقت مصیبت میں کوئی پاس نہ آئے

یوں پیاس میں لاکر کوئی پانی نہ پلائے
اور بعد فنا فاتحہ شربت پہ دلائے

پروا نہیں پیوند ہو گر رخت بدن میں
مرتے ہیں بس اسپر کہ تکلف ہو کفن میں

یوں ہاتھ نہ تھامیں جو گرے بندہ معبود
تابوت کو دنیا ہو جو کاندھا تو ہیں موجود

یوں جانتے ہیں قرض حسن دیئے کو بہبود
زر صرف ہو میت کے جو ماتم میں تو خوشنود

یوں بھول کے بھی ذکر نہیں کرتے ہیں اُس کا
مر جاتا ہے جب کوئی تو دم بھرتے ہیں اُس کا

ہشیار ہو اے قوم کہ دنیا ہے گزرگاہ
رہتا ہے گدا اس میں ہمیشہ نہ شہنشاہ
کیا مرحلہ صعب ہے العظمۃ للہ
ٹھہراتے ہیں رہبر بھی وہ پر خوف ہے یہ راہ

اعمال و عقاید میں نہ ہرگز خلل آئے
کیا جانئے کس وقت پیام اجل آئے

کچھ وقت معین نہیں انساں کی اجل کا
آج اٹھ گئے وہ کرتے تھے سامان جو کل کا
بندہ وہ ہے پابند رہے نیک عمل کا
پلہ وہی بھاری ہے جو ہو جرم ہے ہلکا

کیا خاک کا بوجھ اسکے لئے قبر میں کم ہے
ہو اور گناہوں کی گرانی تو ستم ہے

عجز و انکسار

خاموش زباں دعوئے بیجا نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعوی نہیں اچھا
آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوہ نہیں اچھا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زنہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار
اعلی ہے اگر جنس تو کیا حاجت اظہار
خود مشک ہو خوشبو تو نہ خوشبو کے عطار

جو بد ہے سو بد ہے جو نکو ہے سو نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے

انساں کے لئے عجز ہی لازم ہے بہر کیف
ہر خانہ دنیا میں ہر اک پیر و جواں حنیف
گر صاحب جوہر نہ چلے جھک کے تو صد حیف
خارج ہوا اصالت سے وہ کستی نہیں جو سیف

نعمان ۱۲

آفاق میں یوں فیض نگیں عام نہ ہوتا

ہوتا نہ فروتن تو کبھی نام نہ ہوتا

بے نقطہ بند

وہ طاہر و اطہر ہو اگر معرکہ آرا
معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہ ہو عمر کو مارا
صمصام کا اک وار ہوا اسکو گوارا

والد گرامی دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہو بس ملک عدم ہو

سردار امم محرم اسرار محمدؐ
مہر و اسد اللہ کا دلدار محمدؐ
دلدار و دل آرام و مددگار محمدؐ
ممدوح ملک مالک سرکار محمدؐ

سرور کہ و اسلام کا اس مالک کل کو
آرام دو اک دم دل سردار رسل کو

کس کا اسد اللہ سا ہوا والد مرحوم
حلال مہم مالک کل طاہر و معصوم
صدر دو سرا رحم دل و سرور معلوم
آسودہ ہو ہر سالک و گمراہ ہو محروم

معصوم کا دلدار ہو سالار امم ہو
اولاد کا اس عالم و عادل کو الم ہو

اس طرح کا والا ہمہ اسطرح کا سردار
اس طرح کا عالم کا ممد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار
وہ اصل اصول کرم داور دادار

حاصل اگر اک مرد دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو اسد اللہ کو مارا

اعلیحضرت نظام حیدرآباد کا میرزا اوج اور میر رشید کی مرثیہ خوانی کو سماعت فرمانا

لکھنؤ کے حکمراں شیعہ تھے اور میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی دھوم شہرۂ آفاق ہو چکی تھی لیکن میں نے نہیں سُنا کہ میر انیس یا مرزا دبیر کسی امیر و وزیر کی مجلس میں پڑھتے ہوں اور جانعالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ بنفس نفیس اُس مجلس میں تشریف لے گئے ہوں۔ اور نہ میر انیس نے بادشاہ کے دربار میں باریابی کا خیال کیا کیونکہ خود اُنکے دربار کے لئے ساری دنیا باریابی کا موقع ڈھونڈتی رہتی تھی۔ البتہ مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ نے مرزا دبیر کو بلایا کیا۔ اور اُن کے کلام کی سماعت فرما کر اُن کے کمال کی داد دی۔ لیکن اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ نواب میر محبوب علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ و اقبالہٗ فرمانروائے حیدرآباد نے عشرہ چہلم ماہ صفر ۱۳۲۴ھ میں بنفس نفیس نواب فیاض علی خاں بہادر کے امام باڑہ میں تشریف لے جا کر ممبر کے سامنے بغیر سونی و مسند تکیہ سادہ طور پر نشست فرمائی اور جناب میرزا اوج خلف جناب میرزا دبیر مرحوم کی اعجاز بیانی کو دیر تک سماعت فرماتے رہے اور ختم محفل تک شریک رہے۔

یہ موقع میرزا اوج نے ایسا پایا جو اُنکے والد بزرگوار کو بھی حاصل نہ ہوا تھا اور جس سے زیادہ میرزا اوج کے لئے کوئی اوج نہیں ہو سکتا لیکن اس کے بعد جناب میر انیس کے خاندان میں کسی کو حضور والا کی سماعت کا فخر حاصل نہ ہوتا تو آپس میں ایک قسم کا چرچا کیا جاتا جس سے اس پارٹی کی دلشکنی متصور تھی لیکن اعلیحضرت نے

دوسری پارٹی کو بھی پورے طور سے اپنی عزت افزائی اور سخن شناسی کا موقع دیا اور حضور ممدوح بہ نفس نفیس نواب بہرام جنگ بہادر کے امام باڑہ میں تشریف لے گئے اور جناب رشید کی مرثیہ خوانی کو خوب دل لگا کر سنا۔ اور چونکہ خود اعلیٰ حضرت کو شاعری میں ملکہ راسخہ حاصل ہے۔ اس لئے جا بجا جناب رشید کی سلاست و فصاحت کی داد دیتے رہے۔ حیدرآباد میں یہ پہلا موقع ہے کہ فرمانروائی ملک نے سبط شہید کی مجلس عزا میں شرکت کی ہو۔ نواب فیاض علی خاں بہادر اور نواب بہرام جنگ بہادر پہلے امیر سردار ہیں جن کو اس موقع پر اعلیحضرت کے خیر مقدم کا فخر حاصل ہوا۔

اسی طرح جناب میرزا اوج اور جناب میرزا رشید پہلے مرثیہ خواں ہیں جنکی اعجاز بیانیوں نے حیدرآباد جیسے مقام میں یہ اثر پیدا کیا کہ اعلیحضرت نظام حیدرآباد کے دل میں انکی گنجائش پیدا ہوگئی اور وہ انکے سننے کو بہ نفس نفیس تشریف شریف لاکر شریک مجلس عزا ہوئے جس نے حسین مظلوم کی روح کو بے انتہا خوش کیا ہوگا اور جسکا ذکر تمام ملک میں تحسین و آفریں سے کیا جاتا ہے اور کیا جائیگا خداوند عالم اعلیحضرت نظام خلد اللہ ملکہٗ و اقبالہٗ کے عمر و اقبال میں ترقی فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

حضرت اوج کو اعلیحضرت نے پانچ کشتیاں آنبوں اور خربزوں کی بھیجی تھیں اس پر فی البدیہہ ایک رباعی تصنیف کر کے بطور شکریہ بارگاہ خسروی میں ارسال کی وہ رباعی یہ ہے۔

رباعی

اوج کو اوج ملا پرورش آصف سے — کشتی نور میں ہر خربزہ خورشید بنا
انبۂ تازہ و تر دیکھ کے دل سینے میں — بول اٹھا انبتک اللہ نباتا حسنا

نقلیات

نقل شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے مشاعرہ میں یہ طرح ہوئی۔

روح القدس سے ہے نام مرے ہمصفیر کا

دونوں اُستادوں کی معرکۃ الآرا غزلیں اُن کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ ناسخ کی غزل کو زیادہ شہرت ہوئی اور یہ مطلع زبان زد خاص و عام ہوگیا ؎

بلبل ہوں بوستانِ جناب امیرؑ کا روح القدس سے ہے نام مرے ہمصفیر کا

میر صاحب کی ابتدائے مشق تھی۔ غزل کہنے سے طبیعت کو روک لیا گیا تھا اس لئے اسی زمین میں سلام کہا اور نواب شرف الدولہ بہادر کی مجلس میں پڑھا جہاں اس سے پہلے وہ مشاعرہ ہو چکا تھا۔ سُننے والے ایک ایک مصرع کو لے اُڑے۔ اور جا بجا میر صاحب کے سلام کی دھوم ہوگئی۔ راقم نے سلام کے چند اشعار متن کتاب میں اور الحق جب ناسخ اور آتش کی غزلوں کے سامنے اس سلام کو دیکھا جائے تو میر صاحب کے کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر صاحب کے کئی مطلعوں میں سے ایک مطلع یہ ہے ؎

حافظ اگر ہو عدل جناب امیرؑ کا کرتہ پہن لے جسم میں شعلہ حریر کا

نقل۔ میر قربان علی سالک (شاگرد میرزا غالب) اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ء کی یادداشت لکھتے ہیں۔

میں دو مہینے سے لکھنؤ میں وارد ہوں۔ دلی میں میرزا غالب اور اُستاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سُنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے۔ ایک طرف کا معتقد دوسری

طرف والوں میں ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر۔ میں نے اپنے آپ کو میر انیس کے طرف داروں میں رکھا ہے۔ ایک روز میر صاحب سے دلّی کا ذکر آگیا۔ طرز بیان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تک اُن کے دل میں دلّی بسی ہوئی ہے۔ اپنی جائے سکونت (سبزی منڈی) کو فرمانے لگے۔ یہ اسی باغ کا سبزہ زار ہے۔ مرزا غالب کو یگانۂ فن کے لفظ سے یاد کیا۔ اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا۔ کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا ؎

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چُپ سی لگ گئی۔ جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا سے اُس کی زلف اڑ رہی ہے اور میر صاحب اُس کو دیکھ دیکھ کر ادائے کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ ایک روز فرمانے لگے دلی کا کچھ کلام سناؤ۔ میں نے میرزا غالب کی یہ غزل پڑھی ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی اُس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دنیا میں مجھے خاک اڑانے نے ڈبویا
ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا خوب کہا ہے یہ کہکر فرمانے لگے لکھنؤ والے روکے ہے۔

کھینچے ہے نہیں بولتے اور ڈبویا بھی اُن کی زبان پر نہیں مگر میں لکھ جاتا ہوں۔

نقل ۔جناب عشق سے اور جناب میر صاحب سے قرابت قریبی تھی۔ اتفاق سے کچھ بے لطفی ہوگئی اور طرفین کی بیگمات نے اور بات بڑھا دی۔ ایک روز جناب عشق کا ذکر آیا جبکہ میر صاحب برافروختہ ہو رہے تھے۔ لیکن اُس وقت میں بھی میر صاحب نے لطف بیان پر قابو رکھا۔ فرمایا کہ میں عشق کو خوب جانتا ہوں اُن کو پہلے ایک بات نکالنا پھر رونا دھونا خوب آتا ہے۔

عشق سے ہے تازہ کار تازہ خیال ۔۔۔ ہر جگہ اُس کی اک نئی ہے چال
کہیں آنسو کی یہ روایت ہے ۔۔۔ کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے

میر صاحب نے یہ شعر اس موقع پر پڑھے ہے گویا میر تقی میر نے اسی موقع کے لئے تصنیف کئے تھے۔

نقل ۔میرزا دبیر کا ایک بے نقطہ مرثیہ مشہور ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

ہمطالع ہما مراد ہم رسا ہوا ۔۔۔ طاؤس کلک مدح اُڑا اور ہما ہوا
مطلع ہمارا مطلع مہر سما ہوا ۔۔۔ اور دودحہ کلام سراسر ہرا ہوا
ہوگا عطارد اسم معرا ہمارا عام
کس کس کا اس طرح کا مسلم ہوا کلام

ایک صاحب نے میر انیس سے ذکر کیا کہ میرزا دبیر نے ایک مرثیہ لکھا ہے جس میں اول سے آخر تک کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا۔ میر صاحب مسکرا کر بولے یہ کہئے سر سے پانوں تک مہمل ہے۔ جو لوگ جانتے تھے کہ اس صنعت کو صنعت مہملہ کہتے ہیں وہ میر صاحب کے لطف بیان سے محظوظ ہوئے لیکن راقم نے جناب آغا محمد صاحب وکیل جوڈیشل لکھنؤ سے سُنا ہے کہ یہ مرثیہ میرزا دبیر کا نہیں بلکہ آغا صاحب کے

خاندان میں کسی کے زورِ طبع کا نتیجہ ہی جو اختر تخلص فرماتے تھے اور اختر کی رعایت سے اس مرثیہ میں عطار تخلص رکھا مجھ کو آغا صاحب کا بتلایا ہوا نام بھول گیا شاید مرزا مہدی نام بتایا تھا

نقل میر انیس اپنے فرزند میر خورشید علی صاحب نفیس سے کچھ ناراض ہو گئے تھے اور وہ ناراضی اس درجہ پہنچ گئی تھی جس سے دونوں میں سخت کبیدگی تھی اور میر نفیس کی دوسری والدہ اُن کی طرف سے میر انیس کو بھڑکاتی رہتی تھیں اس لئے میر صاحب کو میر نفیس کی طرف سے بالکل بے پروائی تھی۔ ایک روز ایک صاحب نے باپ بیٹوں میں صلح کرانے کے لئے یہ تمہید پیدا کی کہ میر نفیس کا ایک مرثیہ سُن کر میر صاحب سے ذکر کیا کہ ایک صاحب نے مرثیہ لکھا ہے جو بالکل آپ کے کلام سے ملتا جلتا ہے۔ میر صاحب یہ سُن کر چونک پڑے اور فرمایا میں اُس مرثیہ کو دیکھ سکتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کل حاضر کروں گا۔ دوسرے روز وہ مرثیہ لے گئے۔ میر صاحب نے اول سے آخر تک اُس کو تعجب سے دیکھا اور فرمایا کہ بیشک یہ میرے خاندان کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور ترکیب کلام بھی مجھ سے ملتی ہوئی ہے۔ شاید میر مونس کی تازہ تصنیف ہے۔ اُن صاحب نے کہا نہیں۔ جب میر صاحب نے زیادہ اصرار سے پوچھا تو کہدیا کہ یہ آپکے صاحبزادہ گرامی میر نفیس کی تصنیف ہے۔ یہ سُن کر میر صاحب نے وہ مرثیہ پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اور محبت پدری میں جوش میں فرمایا کہ میر نفیس کو بُلا لاؤ۔ چنانچہ میر نفیس حاضر ہوئے اور میر صاحب کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ میر صاحب نے گلے لگایا اور ہونہار فرزند کے زورِ طبیعت کی داد دی اُسکے بعد میر نفیس کو اپنا صحیح جانشین بنا کر چھوڑا۔ میر نفیس کا درجہ شاعری میر انیس سے کم نہیں۔

نقل ۔ میر مونس۔ میر نفیس میر انیس کے سامنے حاضر تھے۔ دوسرے خوش فکروں میں سے ایک صاحب نے کہا کہ آپکے خاندان میں سب صاحبوں نے اپنے اپنے مذاق کے موافق مرثیے لکھے ہیں اگر ایک مضمون پر ایک بحر میں تین مرثیے لکھے جائیں

تو بڑی دلچسپی سے دیکھے اور سُنے جائیں گے چنانچہ وہیں یہ بات طے ہوگئی کہ حضرت زینب کے بیٹوں کی جنگ کو مع تشبیب صبح کے ایک بحر میں لکھا جائے اور چند لوازم جمع کئے جائیں۔ اُس پر میر نفیس نے یہ مرثیہ لکھا۔

جب عابدوں کو طاعت رب میں سحر ہوئی
تیاری نمازِ جماعت ادھر ہوئی

اور میر مونس نے اس مرثیے میں اپنی طاقت شاعری صرف کی ؎

جب آسماں پہ مہر کا زریں نشاں کھُلا — پھولی شفق درخشِ آسماں کھُلا
جھونکے چلے نسیم کے باب جناں کھُلا — فوجِ حسینؑ میں علمِ ندفشاں کھُلا

صف بستہ تھے حسینؑ کے پیارے زمین پر
ذرے تھے آسماں پہ ستارے زمین پر

اور میر انیس نے یہ مرثیہ لکھا ؎

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

ناظرین کو ان تینوں مرثیوں کے دیکھنے سے تینوں کے مدارج شاعری کا فرق اور میر صاحب کا درجہ امتیاز معلوم ہو سکتا ہے۔

نقل۔ میر انیس کو ایک امیر نے مدعو کیا۔ کھانے کے بعد آم آئے۔ چند احباب جمع تھے اُن میں ایک حکیم صاحب بھی تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا کیوں جناب حکیم صاحب آم کھانا کیسا ہے؟ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ آم کا مزاج حار۔ ہے اور آج کل فصل بھی گرم ہے پانی کھل کر نہیں برسا اس لئے احتیاط مناسب ہے لیکن حکیم صاحب نے جب دیکھا کہ اچھے اچھے آم صرف کلام ہوئے جاتے ہیں تو چند آم چن چن کر ایک قاب میں علیحدہ رکھ لئے تاکہ پوری دل جمعی سے سیر ہو کر کھائیں۔ اُن صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب ہمیں تو آپ منع کرتے ہیں اور اپنے لئے یہ سامان۔ حکیم صاحب بولنے نہ پائے تھے

کہ میر انیس نے فرمایا فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔

نقل میر انیس الہ آباد تشریف لے گئے قدر شناس رئیس نے منجملہ اور لوازم ضیافت کے ایک من برف کی سل بھیجی۔ میر صاحب کے رفیقوں میں ایک میر صاحب تھے انہوں نے گڑھا کھدوا کر اس میں رکھ دی تاکہ بقدر ضرورت نکالتے رہیں شام کو وہ رئیس تشریف لائے اور برف کا ذکر آ گیا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ آپ نے حاتم کا کام کیا تھا مگر میر صاحب نے قاروں کی طرح زمین میں دفن کیا تاکہ وہ چاندی کا ڈلا پانی ہو کر نہ بہہ جائے۔

نقل۔ راقم حیدرآباد کو جا رہا تھا منمار کے اسٹیشن سے اس گاڑی میں سوار ہوا جس میں میر انیس کے بھائی اور میر وحید کے باپ جناب میر انس تشریف رکھتے تھے۔ پھر حیدرآباد پہنچکر جناب موصوف شمس العلماء مولانا سید حسین صاحب بلگرامی کے ہاں فروکش ہوئے میں بھی کئی مرتبہ زیارت کو حاضر ہوا۔ ایک روز میں نے عرض کی۔ کیوں قبلہ جناب غفراں مآب (میر انیس مرحوم) کا کلام اس کے علاوہ اور بھی ہے جو چھپ کر شائع ہوا یا عام طور سے شائقین کے ہاتھوں میں پہنچا۔ یہ سن کر فرمانے لگے۔ اس کو کیا پوچھتے ہو سیکڑوں مرثیے اور سلام شائع ہونے سے باقی رہ گئے ان میں کتنے مرثیے خود میر صاحب نے کہیں نہیں پڑھے وہ اخیر وقت کے لئے رکھے تھے کہ جب پیرانہ سالی میں ضعف ہوگا تو زور جوانی دکھایا جائے گا۔ میں نے پوچھا پھر وہ کیا ہوئے کس کے پاس پہنچے تو ایک پرحسرت لہجہ میں فرمانے لگے اس کا حال نہ پوچھئے ؎

ہر کس از دست غمے نالہ کند

سعدی از دست خویشتن فریاد

لیکن اس مبہم کی کچھ تفصیل نہ فرمائی ہاں طرز کلام سے معلوم ہوا کہ گھر کے گھر ہی میں ایسا ہوا۔ بہرقطع نظر اسکے مجکو اسوقت میں ان باتوں کی تفتیش بھی نہ تھی اب جو لکھنؤ گیا اور ان کا پتا لگانا چاہا تو کسی غیر مستند کلام کا کچھ پتا نہ ملا۔ بااین ہمہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے

کہ اب تک میر صاحب کا تمام کلام اُن کے خاندان میں محفوظ ہے۔ گو اُس کی چھپانے یا اُس میں دوسرا جوڑ لگانے کی کوشش کی جاتی ہو۔ البتہ آیندہ اُس کے تلف ہو جانے یا دوسرے کلاموں میں مل جانے کا سخت اندیشہ ہے۔

میر انیس اور سرقہ

اُردو میں میر انیس کا درجہ کسی طرح فارسی میں فردوسی طوسی کے درجہ سے کم نہیں بلکہ چار باب میں بڑھا ہوا ہے۔

(۱) فردوسی نے بادشاہوں اور شاہنشاہوں کے مختلف معرکہ ہائے جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے میر انیس نے ایک غریب مظلوم کی لڑائی کی تصویریں کھینچی ہیں۔

(۲) فردوسی نے غم کی تصویر نہیں کھینچی۔ میر صاحب نے غم و درد کی وہ تصویر کھینچی جس سے ہر آنکھ نمونہ ابر فشاں نظر آتی ہے۔

(۳) فردوسی کو ادب کی دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ میر صاحب نے اس وادی میں وہ کام کیا جس سے اُردو ادب آموز ہو گئی۔

(۴) فردوسی کو اصلاح زبان کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میر صاحب کو قدم قدم پر زبان کی اصلاح و درستی سے کام لینا پڑا۔

فردوسی کی تصنیف سے میر صاحب کی تصنیف زیادہ ہے۔ ایسے شخص کی نسبت کسی شخص کا چند شعر پیش کر کے یہ کہدینا کہ ان شعروں کا مضمون فارسی شعروں سے ملتا ہے اس لئے یہ سرقہ ہے کہنے والے کے لئے چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ اس بات کی تنقید کے لئے اُردو کی پچھلی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ اُردو کے زبان آوروں میں سودا۔ میر۔ مصحفی۔ انشا۔ ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ مومن نے تو میدان غزل میں ایک قسم کا کام کیا۔ بعض الفاظ ایک وقت میں سرمایۂ ناز سخن تھے دوسرے زمانہ میں متروک

ہو گئے لیکن میرزا غالب اور میر انیس نے اُردو کے میدان ادب کو ہموار کر کے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں پیدا کیں۔ اس لئے لازمی طور سے اُن کو بعض مقام پر فارسی مطالب کو اپنی زبان میں لانے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک زبان کے خیال دوسری زبان کے مقال میں جانا سرقہ نہیں ہو سکتا۔ اور کہنے کو تو جو لکھا جائے وہ انشاء و ادب میں شمار ہوگا۔ لیکن فی الحقیقت ادب کا مفہوم حسن و عشق کے امتیازی مطالب اور امیروں اور بادشاہوں کے درباری مقاصد کو ادا کئے بغیر پورا نہیں ہوتا اس لئے اردو میں ادبیات کا حصہ میر انیس کے کلام سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ اُن کے بعد غزل کہنے والوں کی باری آئیگی کیونکہ اُن کو درباری ادب سے بہت تھوڑا تعلق رہا ہے بلکہ جو لوگ معرفت آشنائے تصوف نہیں۔ انکی شاعری منشاء ادب سے باہر نکلے گی۔ مجکو تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے ادیب نے جو دو زبانوں کی آمد و آورد اور ہر ایک کے معانی و مبانی سے واقف ہیں کسی ایک کم مایہ چھچھورے کے طرز عمل کی کیوں تقلید کی۔ جو چند شعروں کے لئے "سرقات" کی نام سے ایک علیحدہ فصل قائم کر دی جس کا نتیجہ کچھ نہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں حیدر آباد میں جناب مولوی سید علی حسن خان صاحب سابق ناظم بندوبست ممالک محروسہ سرکار نظام حال ریوی نیو ممبر کونسل ریاست اندر کے بنگلہ پر شریک جلسہ تھا اُس میں خدا بخشے ملا محمد عبد القیوم صاحب مرحوم تعلقہ دار اول کے بھائی مولوی محمد عبد الحی صاحب مددگار بندوبست تشریف لائے اور شعر و سخن کا ذکر نکلا۔ سب صاحب متوجہ ہو بیٹھے۔ جب اپنی اپنی باری ہو چکی تو دوسرے اساتذہ کا نمبر آیا۔ میں نے میر انیس کا یہ مطلع پڑھا ؎

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے　　شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

کیسا لاثانی مطلع ہے۔ مولانا عبد الحی صاحب نے یہ مطلع سنکر اُسی مضمون کا ایک

فارسی شعر پڑھا اور آخر کو خود فرمایا کہ میر صاحب کو تو ارد ہوا ہے یا جان بوجھ کر اُسی مضمون کو اپنی زبان میں ادا کر دیا ہے اور دکھایا ہے کہ جو مضمون فارسی میں بیساختگی سے ادا ہوا اُسکو اُردو میں یوں ادا کرتے ہیں۔ پس میرے نزدیک ایسے مقامات پر یہی رائے دی جا سکتی ہے چنانچہ مولانا شبلی کے رسائل اور مقولات میں جو مقامات عربی سے اخذ کئے گئے اور عربی سے لائے گئے ہیں جیسے رسالہ الندوہ میں سلسلہ تولید والا مضمون علامہ اندلسی کی کتاب سائنس اور اسلام کے مضمون سے ملتا ہوا ہے ضروریات ادب کے تحت میں دیکھے جا سکتے ہیں یا ہماری قوم کے اعلیٰ گریجوایٹ جن کو علم و ادب سے سروکار ہے شیکسپیر ملٹن وغیرہ کے خیالات کا چربہ اپنی زبان میں اتارتے اور مغربی خیالات کو مشرقی مقالات میں ادا کرتے ہیں جیسے کسی نے انگریزی میں ایک نیچرل نظم دیکھی اور اُردو میں اُس رنگ کی نظم تیار کی تو وہ ہرگز داخل سرقہ نہیں ہو سکتی۔ ایسے مواقع کے لئے متکلم کا درجہ اور اُس کی نیت اور منشار کا دریافت کرنا ضرور ہے۔ اور علامہ شبلی نعمانی نے بھی اسی اصول کو مدنظر رکھ کر نساخ کی تراش خراش کا خاتمہ کر دیا ہے۔

میر انیس کی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ اور فصیحانہ بندش

چاندی سونا ہر جگہ پایا جاتا ہے لیکن ایک معمولی سنار اور سادہ کار جڑیئے کا فرق علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ہی الفاظ بھی ہیں جو عام طور سے بولے جاتے ہیں لیکن ہر لفظ کا اپنے موقع پر سے چسپاں ہونا ایسا ہے جیسے ایک انگوٹھی پر سادہ کار جڑیئے نے ہیرے کے نگ جڑ دیئے ہوں۔ میر انیس معمولی لفظوں کو جس خوبصورتی سے کھپاتے ہیں وہ اُن کا حصہ ہے۔ اکثر مقام پر انکی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ سونے

میں سہاگے کا کام دیجاتے ہیں میں یہاں یکے از ہزار واند کے از بسیار چند مصرعے اور اشعار نقل کرتا ہوں
انقلاب زمانہ کا ذکر کرکے فرماتے ہیں ع جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے
زمانہ کی شکایت کرکے کہتے ہیں۔ ع مولا یہ کلیجے کے پھپھولوں کی دوا تھی ؛
سوار ہوتے وقت امام حسینؑ کی عجب حال لکھتے ہیں ع گردان کے دامن علی اکبر کو پکارے ؛
تلوار کے متعلق کہتے ہیں ع نا ہیں نہیں غصہ سے اجل چیں بجبیں ہے ؛
ع جوہر تھے کہ پہنے تھی دلہن پھولوں کا گہنا ؛ ع دو نرخ کر زبانوں سے بھی آنچ اسکی بری تھی
ع قلزم کا بھی دھارا ہو تو پانی کو نہ پہنچے ؛ ع قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے
ع تلواریں دھر کھینچتی ہیں یاں ہو نہ پہ دم ہے ؛ ع پی پی کے لہو اور بھی دم بڑھ گیا اُس کا
ع منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی ؛
امام حسینؑ کی جنگ کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع پھیلائے تھے دامن کو پھریرے کہ اماں دو
امام حسینؑ گھوڑے سے فرماتے ہیں ع بہتر ہے کہ اتروں نہیں تیور اکے گرونگا
امام حسینؑ کی حالت ضعف کو بیان کرتے ہیں ع خود ٹیک کے تلوار کو سمجھے شہ عالی
غش کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع جھک جاتے تھے ہر ذبح پہ جو غش میں شہ ابرار
حضرت زینب گھوڑے کو بسوار دیکھکر کہتی ہیں ع گھوڑا تو ہے کوتل کدھر اُتری ہے سواری
میر انیس اپنے حاسدین کی نسبت کہتے ہیں ع بے تیغ کٹے جاتے ہیں شمشیر زباں سے
امام عالیہ السلام کی رحلت کے وقت کا بیان کرتے ہیں ع بہنیں پچھاڑیں خاک کھاتی تھیں کر کے
بین ؛ مدینہ سے کوچ کرتے وقت سواری کی تصویر کھینچتے ہیں۔ ۵

ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لئے فراش کھڑے ہیں

صغرا علی اکبر سے کہتی ہیں۔ ع حقدار ہوں میں نیگ کا میرے بھی رہے دھیان
زنانی سواریوں کے متعلق فرماتے ہیں ۵

باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے ع شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

مدینہ سے سواری نکلنے کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع

تھا ناکے تلک شہر کے اک شور قیامت

جب شہادت مسلم کی خبر آئی اُس وقت کی حالت بیان کرتے ہیں ؎

کرتی تھی بیان زوجۂ مسلم یہی پیہم کیا ہے کہ بندھی جاتی ہوں گھٹتا ہی مرا دم

کربلا میں بچوں کی حالت بیان فرماتے ہیں ع خورشید سے مُنہ گرد یتیمی سے اٹے ہیں

لڑائی کے وقت بچوں کی کیفیت کا بیان ہے ع بچے بھی ماری ہول کی تر ہیں پسینے میں

لڑائی کے وقت دریائے فرات کی موجوں کا حال بیان کرتے ہیں ع

لہریں یہ ہیں کہ چلتی ہیں تلواریں فوج میں

شامیوں کی نسبت لکھتے ہیں ع ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

باجوں کی نسبت لکھتے ہیں ع باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

فرزندان زینب کی تصویر کھینچتے ہیں ع خط اک طرف مسیں بھی کسی کے عیاں نہیں

کربلا کی نسبت کہتے ہیں ع روئے زمین پر ہے یہ ٹکڑا بہشت کا

کوفہ میں ایک ظالم کی ماں نے فرزندان مسلم کو چھپا رکھا تھا جب وہ آیا اور پوشیدہ تجسس کرنے لگا تو وہ اصل بات کو چھپانیکے لئے باتیں بنانے لگی اس موقع پر کہتے ہیں ع

پاس آکے ضعیفہ نے بہت باتوں میں گھولا

تلوار چلنے کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع تھی مینھ کی طرح خاک پہ بوچھاڑ سرو کی

تیروں کی نسبت فرماتے ہیں ع بوچھاڑ تھی تیروں کی ساون کی جھڑی تھی

پیاسے گھوڑوں کی نسبت فرماتے ہیں۔ ع تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہوئے

کربلا کے واقعات نے عزیز و انصار پر جو اثر کیا اُس کی نسبت لکھتے ہیں ع

دل بند رہ گئے تھے چاند سے چہرے اداس تھے

گھوڑوں کی نسبت فرماتے ہیں ع راتوں میں کوندتے ہوئے بجلی سے راہوار
حُر کی حالت لکھتے ہیں ع گھوڑے پہ ڈگمگانے لگا حرنامدار
امام حسینؑ کی رخصت کے وقت کا حال بیان فرماتے ہیں
ع در پہ ملکتی رہ گئی زینب جگر کباب
فرزندان مسلم کے حال میں لکھتے ہیں ع اب چھاتیوں کو توڑتی ہیں آہونکی بھالیں
متفرق مصرعے اور اشعار ملاحظہ ہوں ع چوٹی کے جواں بھاگ گئے پھینک کے تلوار
ع باگیں جو اُٹھائیں تو فرس بن گئے آہو ۵
برباد کیا رو میں سواروں کو دبا کے رہوار بھی اسوار تھے گھوڑوں پہ ہوا کے
ع تھیں کہنیاں پہونچوں سے جدا ہاتھ نہ سنبھالے ع آدھے ہوئے جاتے تھے لعین جان کو ڑ سے
ع دریا کے تھپیڑے تھے طمانچے تھے قضا کے ع دس بیس تو مر جاتے تھے ٹاپوں سے کچل کے
ع ایسا تو کوئی نیند کے ماتے نہیں ہوتا
حضرت زینب بچونکی نیچونکی نسبت فرماتی ہیں ع اللہ انہیں چھوٹی سی تلوار نہیں جس دے
ع دولھا کا پسینہ ہے کہ ہے عطر دلہن کا
ع بجلی سی لگی کوندنے ڈھالوں کی گھٹائیں
ع نیزے کو جو دیکھا تو نہ بوڑی نہ سناں تھی ع چنگھاڑ کے رن میں صفت دیو پکارا
قاسم وارزق کی نیزے بازی ع تھی زد جو کڑی ٹوٹ گئیں ڈانڈیں بھی لڑکر
حضرت قاسم ع تیور اکے جھکے تھے کہ پڑی تیغ کمر پہ
حضرت عباس کی تلوار ع ناب اُس کی نہ تھی مانگ نکالی تھی پری نے
ع ہلتا تھا کلس خیمہ کا ہی ہی کی صدا سے ع بپھرا پسر شیر الٰہی غضب آیا
ع رہوار کو جھنجلا کے کبھی کاوہ پہ ڈالا
روضہ کی نسبت لکھتے ہیں ع کیلیں نہیں اُس در پہ ستاری سے جڑے ہیں

ع گچ زاں کی بنائی ہے ستاروں کو ملا کر ع جو اُس کا شبکہ ہے وہ اک چشم پری ہے

حضرت عباسؓ کے گھوڑے کی نسبت ع اندھیاری نہ تھی چہرے پہ گھونگٹ تھا دن کا

خیمے کے لڑکے ع تکتے تھے سوئے نہر سراچوں کے تلے سے

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں ع آفاق میں مجھ سا کوئی ساونت نہیں ہے

ع گردوں سے مری تیغ کا لنگر نہیں اٹھتا

حضرت عباس کے مقابل ع لچکاتے ہوئے ڈانڈ بڑھے برچھیوں والے

خیمہ کی نسبت ع آئینہ ہائے نور تھے ثقبے قنات کے

غرض کہاں تک انتخاب کیا جائے اور کس کس بات کی داد دی جائے ؎

زپائے تا بہ سرش ہر کجا کہ مے نگرم ز
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

میرزا دبیر کا رنگ

بعض مقامات پر جہاں میر صاحب کی شوکت کلام آورد کے پنجے میں پھنس گئی ہے میر صاحب کے کلام میں بھی میرزا دبیر کا رنگ آگیا ہے جیسے فرماتے ہیں ؎

ہم نور ہیں گھر طور تجلے ہے ہمارا — تخت بن داؤد مصلا ہے ہمارا

شبدیز نے چھیل بل میں عجب ناز دکھایا — فتراک نے اوج پر پرواز دکھایا

طے کر کے پھری کونسا قصہ تھا فرس کا — باقی تھا جو کچھ کاٹ وہ حصہ تھا فرس کا

چلنے لگی یکدست جو شمشیر دو دستی — معلوم ہوا کٹ گئی سب کفر کی بستی

تلوار نکلنے کی صورت کھینچتے ہیں ؎

عنقائے ظفر فتح کا در کھول کے نکلا — شہباز اجل صید کو پر تول کے نکلا

امام حسینؑ کی قلت اور مخالفین کی کثرتِ فوج پر ریویو کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اُس فوج میں فوج قطب اوج امامت　　آتی تھی نظر نقطہ پرکار کی صورت

خیمہ امام علیہ السلام کی نسبت فرماتے ہیں ؎

گیسوے حور خلد کے ہمسر ہر اک طناب　　دریا تھا وہ تو گنبد گردوں ہر اک طناب

حضرت عباس کے نعرہ جنگ پر لکھتے ہیں ؎

نعرہ جو کیا شیر نے یا حیدر کرار　　اوتادِ اراضی عرب ہل گئے اکبار

میدان کربلا کی حالت بیان کرتے ہیں ؎

اٹھتے تھے تق گرد کے میدان بلا میں　　چنگاریاں اڑتی تھیں سنانوں سے ہوا میں

پُرانی ترکیبیں اور پُرانے الفاظ

میر صاحب آج کے شاعر نہیں میر صاحب کی شاعری کا زمانہ ناسخ و آتش کے وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ کتنے لفظ اور کتنی ترکیبیں زمانہ میر و سودا کی باقی تھیں اسلئے بعض الفاظ میر صاحب کے کلام میں بھی اسوقت کے یادگار نظر آجاتے ہیں جو قابل گرفت نہیں۔ ہر زبان میں یہ تغیر جاری رہتا ہے کہ کل جو الفاظ بولے جاتے تھے آج نہیں بولے جاتے۔ یا پہلے کی ادائے سخن اور تھی اور اب اور ہوگئی جیسے میر صاحب کے کلام میں بعض جگہ دیجو۔ دیجیو۔ کیجو۔ کیجیو۔ پیجو پیجیو۔ لیجو لیجیو مستعمل ہیں۔ اور جدید اصول اشتقاق مصدری کے موافق دینا۔ کرنا۔ پینا۔ لینا۔ صحیح قرار دیتا ہے۔ یا لیویں گے۔ دیویں گے کی جگہ لیں گے دیں گے۔ صحیح قرار دیا جاتا ہے یا مرد کی طرف سے میری جائی کی جگہ میری لڑکی بولتے ہیں ع چہرے کی سجائی سے قبا چست ہے تن کی۔ اب سجائی کی جگہ سجاوت کہتے ہیں۔

یا میر صاحب کے کلام میں گود اور گودی دونوں آغوش کے معنی میں آئے ہیں

لیکن جدید اصول یائے تحتانی کو زاید قرار دیتا ہے ع لو جانے دو غصہ کو مری گود میں آؤ

ع گودی میں گئی باپ کے گھبرا کر وہ بی آس

میر صاحب فرماتے ہیں ع در پہ للکتی رہ گئی زینبؑ جگر کباب ہو اب بلک کر رونا مخصوص بچہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ میر صاحب نے کمر کے لفظ سے کہیں میم کو ساقط کر دیا ہے جیسے

ع کمروں کو کسو گلشن جنت کے سفر پہ

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں ع باندھیں کمریں شہ کے عزیز و رفقا نے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرعہ پہلے کا یادگار ہے میر صاحب کا مصرع ہے

ع یہ روتی ہیں جوں جوں انہیں سمجھاتی ہیں بھیا

اب بھیا کو خلاف فصاحت جانکر بھائی بولتے ہیں۔ ہاں بعض عورتیں بھائی کو بھیا کہہ کر پکارتی ہیں یا بعض گھروں میں ایک بھائی دوسرے کو بھیا کہکر پکارتا ہے لیکن فصاحت پسند نہیں کرتی ایک بند میں لکھتے ہیں ؎

کانپی زمین ہل گیا صدمہ سے چرخ پیر — نکلی لحد سے فاطمہؑ جیب کفن کو چیر

اب یہ ترکیب "جیب کفن کو چیر" داخل فصاحت نہیں رہی ایک مقام پر اٹھارہ بنی فاطمہ کی نسبت فرماتے ہیں ؎

اک رشتہ میں جاگہ انہیں بخشی تھی خدا نے ۔ اب جاگہ کا لفظ متروک ہے

ایک بند میں لکھتے ہیں ؎

گہہ چھپا ابر گہے نکلا وہ مہ اوج شرف — گہے اس صف میں در آیا گہہ روندی وہ صف

گہے دریا کے کنارے گہے صحرا کی طرف — گہے نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہ نجف

قدما میں ایک لفظ کی ایسی تکرار کو پسند کیا جاتا تھا۔ اب انداز فصاحت سے بیگانہ سمجھا جاتا ہے

ایک مقام پر حرؑ کی نسبت امام حسینؑ کا قول نقل فرماتے ہیں ؎

شاہ چلائے کہ اے زینب دام کلثوم — ہاں ہے یاں اسکی نہ خواہر یہ تمہیں ہے معلوم

ہم بھی مظلوم ہیں مہماں بھی ہے اپنا مظلوم　　کون لاشے پہ کرے نالہ و فریاد کی دھوم

یہ ترکیب پہلے کی ہے اب لاش پر نالہ و فریاد کی دھوم نہیں بولتے شیون وغیرہ بولتے ہیں۔ ایک جگہ امام حسنؑ کے جنازہ کی نسبت لکھتے ہیں ع ہفتاد تیر نکلے تھے تابوت شاہ سے لیکن اب اس طور پر ہفتاد کا لفظ کھٹکتا ہے۔ ان سب باتوں کو پچھلے زمانہ کا تبرک سمجھنا چاہیے

عربی لفظوں کی تضمین اور فارسی لفظوں کی ترکیب

میر صاحب نے عربی کے الفاظ جس خوبصورتی سے اُردو میں کھپائے اور فارسی کے لفظ جس خوشنمائی سے اپنی جگہ پر بٹھائے ہیں وہ زیورات پر الماس و یاقوت کے نگینے معلوم ہوتے ہیں عربی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ حر جب زخمی ہو کر گرا تو ان لفظوں میں امام حسینؑ کو پکارتا ہے ؎

اے مددگار معین الضعفا ادرکنی　　اے خداوند جہاں حُر بیدی حُر بیدی

امام علیہ السلام حُر سے کہتے ہیں کہ تو معصیت گزشتہ کا خوف نہ کر۔

ع غافر و راحم و تواب ہے رب عادل ؛ دوسرے مقام پر حُر کے پکارنے پر لکھتے ہیں ؎ حر پکارا بابی انت وامی یا مولا شاہ۔

حضرت عباس عزیز و انصار سے کہتے ہیں ؎

کرتے ہو مصیبت میں جو تم سب مدد شاہ　　بس حق رفاقت ہے یہی اَجرکُم اللہ

فرزندان زینب میں سے بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے کہتا ہے۔

ع کیا خوب لڑے سلمک اللہ برادر

اب فارسی کی ترکیبیں ملاحظہ ہوں۔ فرزندان زینب کے سراپا کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

ان گیسوں میں نگہت مشک تتری ہے　　سنبل کو بھی گلزار میں شوریدہ سری ہے

ع پلکیں کہیں سر تیزی میں نشتر سے زیادہ۔

حضرت قاسم مخالفین کی نسبت کہتے ہیں ع کیا سمجھیں جو وہ مست مئے بیخبری ہیں

ملبوس قاسم کی نسبت ع تکمہ تو ستارہ ہے گریباں مہ نو ہے۔

رجز میں حضرت قاسم کہتے ہیں ع چھیدوں دل ارجن جو کروں تیر کو پرتاب

ابرو کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

اک بیت کے یہ مصرع برجستہ ہیں دونوں　　ظاہر میں کشیدہ ہیں پہ دل بستہ ہیں دونوں

حضرت زینب حضرت عباس سے کہتی ہیں ع منصف ہو تمہیں بھائی مری حق بطرف ہے

امام علیہ السلام کے لشکر کا حال لکھتے ہیں ع خشکیدہ زبانوں پہ سخن شکر کا جاری

حبیب ابن مظاہر کی تصویر کھینچتے ہیں ع انداز جوانوں کا بھی پیرانہ سری بھی

امام حسنؑ کا مزار قریب مزار جناب سرور کائناتؐ بننے پر لکھتے ہیں ع منظور ہے کہ حق کو برابر قرار ہو

مدینہ سے نکلنے کے وقت سواری کی صورت لکھتے ہیں ع آراستہ ہیں بہر سفر سر و قبا پوش

حضرت صغرا کہتی ہیں ع واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی ؛ ایک اور جگہ خون سفید

شدن ہونیکو لکھتے ہیں ع کیا ہو گیا ہے خون زمانہ کا سفید آہ ؛ ایک جگہ اظہار فخر میں فرماتے

ہیں ع گردون کلہ پھینکتا تھا فرق سے مغفر ؛ تلوار کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

یوں تن سے سر گراتی تھی شمشیر آبدار　　جیسے رگِ سحاب کبھی ہو تگرگ بار

حضرت عباس کے گھوڑے کی نسبت فرماتے ہیں ع

رہوار پہ اسپند کیا کبک دری نے

تلوار کی نسبت ع کیا قبضہ سے اس برق جہاں سیر کی نکلے ؛ اس طرح کی سینکڑوں

ہزاروں ترکیبیں ہیں کہاں تک لکھی جائیں۔ میر صاحب نے فارسی کی ہزاروں تشبیہوں اور استعارہ کو

اس خوبی سے اردو میں داخل کیا ہے جس کی اردو ہمیشہ احسانمند رہے گی۔

لکھنؤ میں میر انیس کا یادگار

یوں تو جب تک اُردو ہے میر انیس کا نام مٹنے والا نہیں۔ میر صاحب کا ہر مرثیہ اُن کا بہترین یادگار ہے لیکن عزیزوں۔ دوستوں۔ شاگردوں اور قوم کے ایک ایک فرد پر واجب ہے کہ وہ سب باتفاق مجموعی دامے درمے قلمے قدمے اپنے ایسے فخر قوم کے یادگار کا سامان فراہم کریں جیسے آج کل یورپ میں ایک ایک نامور شخص کے لئے ہو رہا ہے حتیٰ کہ قدر شناس یورپ نے ایشیا اور افریقہ کے مُردوں کو زندہ کرنے کا سامان کیا ہے عمر خیام کے نام سے ایک کلب بنایا گیا ہے جہاں بڑے بڑے زندہ دل اور ایشیائی شاعری کا مذاق رکھنے والے لوگ جمع ہوتے ہیں اور مسلمانوں نے اکثر بزرگوں کے مزار یادگار چھوڑے ہیں اور لاکھوں روپے کے وقف و وظائف معطیوں کے عطار مکارم کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی لکھنؤ میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ایک امیر اور نواب اور انکی بیگمات نے کیسی لاثانی فیاضیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ایک ایک شخص کے بقا خاندان اور یادگار پائدار کے لئے کیا کیا سامان کر گئے ہیں۔ پس میر انیس کے لئے اس شہر اور قوم کی طرف سے کچھ نہ ہونا شرم اور نہایت شرم کی بات ہے۔ خدا کے فضل سے اب بھی لکھنؤ میں جناب شاہزادہ سلیمان قدر بہادر و جناب نواب باقر علی خاں و نواب جعفر علی خاں صاحب (شیش محل) و جناب میرزا محمد عباس صاحب و جناب ابو صاحب متولی حسین آباد اور اکثر نوابین و اہل وثایق ایسے موجود ہیں جن کی ادنیٰ توجہ سے میر صاحب کا اعلیٰ یادگار قایم ہو سکتا ہے جو آنیوالی نسلوں میں اس زمانہ کے فخر کا یادگار ہو فقط

تمت

Post Graduate Library
College of Arts & Commerce, U. P.

وداع

یہ بھی

گل کی بلبل کی نوٹ بانی پیچھے

ذی فضیلت کی نکتہ دانی پیچھے

ترک کلام مرقع بیچنا بی کھیم

موسیٰ سی دنوں زبانی پیچھے

مطبع آگرہ اخبار آگرہ میں چھاپا گیا
سنہ ۱۲۴۳ھ